خوجی

رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد سے ماخوذ
لکھنوی تہذیب و معاشرت سے متعلق ایک مزاحیہ ناول

مرتبہ

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ناشر

راجہ رام کمار بک ڈپو وارثِ نول کشور بک ڈپو لکھنؤ

خوجی

مجوّزہ امتحان ادیب ماہر جامعہ اُردو علی گڑھ
〃 امتحان بی۔ اے بمبئی یونیورسٹی
〃 امتحان بی۔ اے پونا یونیورسٹی

دوسرا اڈیشن

قیمت مجلّد دو روپیہ

سن طباعت فروری ۱۹۵۵ء

طابع و ناشر راجہ رام کمار پریس بکڈپو لکھنؤ

سرشار کا شاہکار

فسانۂ آزاد اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب و مزاح کا یہ بے مثل نمونہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جس میں سرشار نے لکھنؤ کی پرانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ سوسائٹیوں، امراء اور رؤساء کے محلسراؤں گلی کوچوں اور بازاروں کی رنگارنگ زندگی کے مناظر کی تصویر کشی بڑے دلکش انداز میں کی ہے۔ اسی لئے عام طور سے ادبی دنیا میں فسانۂ آزاد کو "مرقع لکھنؤ" کہا جاتا ہے۔

سرشار ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اردو ناول میں ظرافت کا عنصر شامل کرنے کا سہرا سرشار کے سر ہے۔ سرشار کا اندازِ بیان شگفتہ ہے۔ طرزِ تحریر کی ندرت اور شوخی نے ہر جملے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ عبارت سلیس اور بامحاورہ ہوتی ہے۔ پھڑکتے ہوئے جملے، بیساختہ ہنسانے والے فقرے، مکالمات میں برجستگی اور ترکی بترکی جوابات لکھنا ان ہی کا حصّہ تھا۔

سرشار کو روزمرّہ پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کا دماغ الفاظ و محاورات کا خزانہ تھا۔ سرشار کا طرز افسانہ نویسی کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ فسانۂ آزاد کا طرز ناول جیسا ہے لیکن اس میں ناول کی طرح کا کوئی مربوط اور مسلسل پلاٹ نہیں۔ ساتھ ہی کوئی متعین نصب العین بھی نہیں ہے سرشار نے جس ماحول کی عکاسی فسانۂ آزاد میں کی ہے اس کا نصب العین "بے فکرے پن" اور ناعاقبت اندیشی کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اسی لئے فسانۂ آزاد کو نہ تو صحیح معنوں میں ناول ہی کہا جا سکتا ہے نہ مکمل افسانہ ہی۔ وہ ایک دلچسپ صحیفۂ ادب ہے لیکن ایسی دلکش

کہ ہزاروں ناول و افسانے اس پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔

سرشار نے اپنی ظرافت اور خوش طبعی کا پورا زور خوجی کے کردار پر صرف کیا ہے۔ پورے فسانۂ آزاد میں ظرافت کا مرکز خوجی کی ذات ہے، جو لکھنؤ کی پرانی معاشرت اور لاابالی فضا کا پروردہ ہے۔ ایک طرف وہ لکھنوی نوابوں کے مصاحبین کا نمائندہ ہے تو دوسری طرف اس کو بھانڈوں کی نمائندگی بھی حاصل ہے۔ اس لئے لوگ اس کی ہر بات پر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ خوجی کا کردار فسانۂ آزاد کی "روح" ہے۔

سرشار کو فارسی زبان میں کامل مہارت تھی۔ عربی بھی اچھی خاصی جانتے تھے۔ فارسی کے محاورے، ضرب الامثال اور اشعار بے تکلف اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اسلامی علوم و فنون سے بھی ان کو واقفیت تھی جس کا اندازہ فسانۂ آزاد کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ جابجا منطق، فلسفہ اور فقہ کی اصطلاحات استعمال کی ہیں اور پوری صحت کے ساتھ۔ انگریزی زبان بھی سرشار نے سیکھی تھی اور انگریزی ادب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اُن کی نظر میں وسعت تھی۔ صحافت میں ان کا مرتبہ مسلّم تھا۔ وہ اس دور کے سب سے زیادہ مقتدر اور معروف اخبار اودھ کے اڈیٹر تھے۔ محسن اردو منشی نولکشور نے ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کی ادارت سرشار کے سپرد کی اور انھوں نے اس ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اور فسانۂ آزاد کو اودھ اخبار میں قسط وار شایع کرنا شروع کیا دسمبر ۱۸۷۸ء سے ۱۸۷۹ء تک برابر شایع ہوتا رہا اور ۱۸۸۰ء میں علیحدہ کتابی صورت میں طبع ہوا۔ اس دور میں اسکی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اہل ذوق بے چینی سے اودھ اخبار کے تازہ پرچہ کا انتظار کرتے تھے۔

فسانۂ آزاد چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ سرشار کے حالات زندگی نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ان کو اودھ اخبار کی ادارت چھوڑ کر حیدرآباد جانا پڑا اور فسانۂ آزاد کی تحریر کا سلسلہ ختم کرنا پڑا اور سرشار کا تو قلم خدا معلوم اس کو کیا ... پہنچایا

اور اُردو زبان و اَدب کا دامن کتنے انمول جواہرات سے لبریز ہو جاتا۔ یہ فسانہ سرشار نے قلم برداشتہ لکھا۔

شراب نوشی کی زیادتی نے سرشار کی صحت پر بُرا اثر ڈالا مگر انھوں نے صحت کی پروا نہیں کی اور شغل مئے نوشی جاری رکھا آخری زمانہ حیدرآباد میں بسر ہوا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم مملکت حیدرآباد علم و ادب کے بڑے شائق اور ادیبوں اور شاعروں کے قدر دان تھے سرشار بھی ان کی نوازشات سے مستفید ہوئے۔ لیکن سُرخ پری کے والہانہ عشق نے ان کی جان لے لی ۱۹۱۱ء میں اس دنیا سے چل بسے۔ ان کا نام فسانہ آزاد کے باعث ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سرشار نے مضمون نگاری کی ابتدا مراسلۂ کشمیر اور اودھ پنچ کے صفحات پر کی جو اس زمانہ میں یہاں کے خاص اخبار تھے خصوصاً "اودھ پنچ" اپنے طنز و ظرافت کے باعث بے حد مقبول ہو رہا تھا۔ سرشار کے مضامین اہل ذوق پسند کرتے تھے مراۃ الہند اور ریاض الاخبار میں بھی سرشار نے اپنے مضامین شائع کرائے۔ ۱۸۸۳ء میں طبیعات کی ایک اہم انگریزی کتاب کا اُردو میں نہایت اچھا ترجمہ کیا جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔

"فسانۂ آزاد" کی تحریر کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ اس کے متعلق چکبست لکھنوی کے اس مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں جو انھوں نے سرشار پر بہت شرح و بسط سے لکھا ہے۔

"اصل کیفیت فسانۂ مذکور کی بنیاد پڑنے کی یہ ہے کہ جب حضرت سرشار کھیری سے لکھنؤ آئے تو یہاں شب و روز یاران دقیقہ رس کی صحبت میں گذرتی تھی۔ اس صحبت میں جہاں ایک سے ایک حاضر جواب و طرار موجود ہوتا تھا۔ وہاں منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ پنڈت تربھون ناتھ ہجر مرحوم بھی شریک ہوا کرتے تھے ......

اس صحبت میں ایک روز پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھئے اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ نہ ہنسے تو وہ "ڈان کوئک، واٹ" (   ) ہے اگر اردو میں اس طرز کا افسانہ لکھا جائے تو خوب ہے۔ حضرت سرشار کے دل پر اس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی کہ اردو میں "ڈان کوئک ذاٹ" کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ اودھ اخبار میں ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شایع ہونے لگے۔ (مضامین چکبست صفحہ ۳۵ و ۳۶) سرشار نے فسانہ آزاد میں مذکورہ انگریزی ناول کے بہت سے اجزا اس خوبی سے اپنا لیے کہ شبہ بھی نہیں ہوتا۔

سارے افسانہ کا ہیرو میاں آزاد نامی ایک شخص ہے جو مختلف علوم و فنون کے علاوہ حرب و ضرب میں بھی ماہر ہے۔ اور بے فکرا نوجوان ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حسین و صحت مند بھی ہے۔ دن رات گھومتے پھرنے میں مصروف رہتا ہے۔ ایک روز اس کی نگاہیں ایک حسین و جمیل خاتون سے دوچار ہو گئیں اور آزاد اسکی زلف کا اسیر ہو گیا۔ نامہ و پیغام شروع ہوا۔ خاتون مہذب و تعلیم یافتہ تھی اس نے "شادی" اس شرط پر منظور کی کہ میاں آزاد روم جاکر سلطان ترکی کی فوج میں شامل ہوں اور روس کے خلاف جنگ کریں۔ آزاد اپنے عشق میں پکا تھا وہ اپنے مسخرہ اور افیونی مصاحب خواجہ بدیع الزماں عرف خوجی کی معیت میں روم گیا جنگ میں شرکت کی اور کامیاب واپس ہوا اور اپنی محبوبہ سے شادی کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ کل افسانہ اتنا ہے جس کو سرشار نے اس طرح پھیلا کر بیان کیا ہے کہ ڈھائی تین ہزار صفحات لکھ ڈالے مگر دلچسپی اور دلکشی میں فرق نہ آیا۔

جس زمانہ میں یہ فسانہ شایع ہو رہا تھا سارے ہندوستان میں سرشار کی شہرت بھی پھیل رہی تھی اسی زمانہ میں مولانا عبدالحلیم شرر نے سرشار کو اس کے متعلق

ایک خط لکھا تھا جس کی ابتدائی چند سطور ملاحظہ ہوں۔

جناب پنڈت جی صاحب زاد فصاحتکم

حضرت تسلیم "آپ نے فسانۂ آزاد کیا لکھا ہے۔ زبان اردو کے حق میں مسیحائی کی ہے۔ باوجودیکہ وہ بیچاری آج کل کے زباندانوں سے ایسی ڈرتی ہے۔ جیسے میاں خوجی کی قرولی سے ہیں۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ ہماری بیچاری عمدہ زبان کے ایک آپ معین نکلے

(مضامین چکبست صفحہ ۲۸ مطبوعہ آلہ باد)

اسی طرح اس دور کے دوسرے مشاہیر نے بھی سرشار کے اس ادبی کارنامہ کو سراہا۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ لوگوں نے فسانۂ آزاد کی مخالفت بھی کی اور اس کے عیوب کو خوب خوب اچھالا۔ اس میں شک نہیں کہ فسانۂ آزاد میں بہت سی خامیاں بھی ہیں۔ الفاظ و محاورات کی کچھ غلطیاں بھی موجود ہیں۔ حشو و زوائد بھی ہیں لیکن اتنی بڑی تصنیف میں خامیوں کا نہ ہونا باعث تعجب ہوتا۔ چکبست نے بھی ان خامیوں پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن اس مخالفت میں ذاتی رنجشوں کا حصہ زیادہ تھا۔

مخالفت میں سب سے پیش پیش اودھ پنچ تھا۔ جس میں پہلے خود سرشار کے اکثر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اودھ پنچ کو اودھ اخبار سے اختلاف تھا اور سرشار اس کے ایڈیٹر ہوئے تو وہ بھی ہدف ملامت بن گئے اور خواہ مخواہ ذرا ذرا سی بات پر سرشار پر اعتراضات کئے گئے ان کے جوابات بھی نکلے اور مدتوں یہ سوال و جواب جاری رہے۔ اس مباحثہ میں ذاتی حملے ضرور قابل گرفت ہیں لیکن اس سے ادب و زبان کو فائدہ ہی پہونچا۔

فسانۂ آزاد کی مقبولیت میں آج تک کمی نہیں ہوئی تاہم اتنی ضخیم

کتاب کا مطالعہ موجودہ مصروف زندگی میں اہل ذوق کے لئے آسان نہیں۔ پھر اتنی قیمتی کتاب کا حاصل کرنا بھی کافی دشوار ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کے اہم کرداروں اور خاص خاص مضامین کو علیحدہ علیحدہ شایع کیا جائے۔

میرے محترم دوست ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اہل ذوق پر بڑا احسان کیا کہ فسانۂ آزاد کی چار ضخیم جلدوں سے خوجی کے واقعات کو منتخب کر کے اسکو ناول کی صورت میں مرتب کر دیا۔ اس طرح آپ نے ادبی دنیا کی ایک گرانقدر خدمت انجام دی۔ اور اہل ذوق کے لئے سامان دل بستگی فراہم کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اُردو زبان کے اچھے ادیب و نقاد ہیں۔ آپ کا مشہور ناول شام اودھ ادبی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ موصوف انگریزی زبان کے بھی ادیب و نقاد ہیں لیکن اُردو زبان و ادب سے آپ کو غیر معمولی تعلق ہے۔ اُردو میں تنقید، آپ کی اہم تنقیدی کتاب شایع ہو چکی ہے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

خوجی کے مطالعہ سے طنز و ظرافت کا لطف اٹھانے کے علاوہ آپ فسانۂ آزاد کی ادبی افادیت سے بھی بہرہ ور ہو سکیں گے۔

سید امیر حسن نورانی

یکم فروری ۱۹۵۵ء استاد ادبیات اسلامیہ کالج لکھنؤ

(ا)

خوجی لکھنؤ کے ایک نواب کے یہاں مصاحبین میں سے تھے۔ میاں آزاد نے اُن کو نواب کے یہاں جیہی گوئیاں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ نواب صاحب اپنے بٹیر صف شکن کے گم ہو جانے کی وجہ سے بہت متفکر تھے۔ میاں آزاد نے اس بٹیر کو ڈھونڈ لانے کا بیڑا اُٹھایا تھا اور نواب صاحب سے ایک سانڈنی لے کر ایسے رخصت ہوئے کہ آخر کار نواب صاحب کو اُن کی تلاش میں آدمی دوڑانا پڑے۔ جو آدمی میاں آزاد کو تلاش کرنے نکلے اُن میں خوجی بھی تھے اور اُن کی آزاد سے ملاقات اتفاقاً حسب ذیل حالت میں ہو گئی۔

میاں آزاد چلے جا رہے تھے کہ دفعتہً دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پُر بہار کنج میں جھولے پڑے ہیں اور بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کی چھوکریاں پٹیاں جمائے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے مانگ نکالے گلے میں ہار ڈالے ہوئے پینگ لگا رہی ہیں اور دھانی دوپٹوں اور لال لال چُنری کا جوبن دکھا رہی ہیں اور سب پیاری اور شریلی آواز سے لہرا لہرا کر یوں گا رہی ہیں۔

"ندیا کنارے بیلا کن نے بویا۔ ندیا کنارے بیلا بھی بویا چنبیلی بھی بوئی بیچ بیچ بویا گلاب۔ ندیا کنارے"

میاں آزاد کو ان پیاری پیاری گوری گوری لڑکیوں کا گانا اور لہرانا ایسا بھایا کہ تھوڑی دیر اس گنج میں ایک درخت کے سایہ میں ذرا ٹھہر گئے ..... اتنے میں

میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مجسّم شامت پستہ قامت۔ کوتاہ گردن۔ تنگ پیشانی شرارت اور خباثت کی نشانی کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے جھولوں پر نگاہِ بد ڈال رہا ہے جب انہوں نے کئی بار یہ کیفیت دیکھی تو اُن سے نہ رہا گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک چپت زنّاٹے سے جما ہی تو دی۔ ٹیپ کھاتے ہی وہ جھلّا اٹھا اور گالیاں دیکر کہنے لگا "نہوئی ولائتی اسوقت پاس ورنہ بھٹّا سا سر اڑا دیتا اور جو کہیں جوان ہوتا تو اسوقت کھود کر دفن کر دیتا اور جو کہیں بھوکا ہوتا تو کچّا ہی کھا جاتا اور جو کہیں نشہ کی جھانج ہوتی تو گھول کر پی ہی جاتا۔"

میاں آزاد نے نشہ کا نام جو سُنا تو چونکے۔ غور کرکے دیکھا تو سن سے جان نکل گئی یہ میاں خوجی تھے۔ کون خوجی؟ نواب صاحب کے مصاحب۔ کون نواب؟ وہی بٹیر باز۔ کون بٹیر باز؟ وہی صف شکن علی شاہ۔ کون صف شکن علی شاہ؟ وہی جن کی تلاش کو میاں آزاد نکلے تھے۔ چار آنکھیں ہوتے ہی اُنھوں نے اُن پر اور اُنھوں نے اِنپر نظر ڈالی۔

"ایں! بھائی خوجی ہیں۔ اللہ اکبر برسوں کے بعد ملاقات ہوئی مزاج تو اچھا ہے؟"

"جی ہاں مزاج تو اچھا ہے لیکن کھوپڑی بھنّا رہی ہے۔ واہ اُستاد بات کرتے ہی گال کاٹ لیا اور تو در کنار۔ علیک سلیک بالائے طاق۔ آتے ہی وہ زنّاٹے کی ٹیپ جمائی کہ تو بہ ہی بھلی۔ بھلا آخر ہم نے تمھارا بگاڑا کیا تھا۔ اُف کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ نہ ہوئی قرولی۔"

"بھائی معاف کرنا قصور ہوا۔ معاف کرنا"

"جی ہاں جوتیاں لگائیے اور کہئے معاف کرنا اور دل لگی یہ کہ بتیس بتیس دفعہ معافی مانگتے ہیں۔ اچھی مزاج پرسی کی کہ آتے ہی تڑ سے ایک دھول جمائی وہ تو

کہئیے مجھے جلدی سے معلوم ہوگیا ورنہ اسوقت میں آپ کو جان سے مار ڈالتا۔ لانامیری قرولی۔

"اس میں کیا شک ہے کہئیے آخر آپ آئے کہاں؟"

"آپ ہی کی تلاش میں آئے تھے۔ آپ نے ملتے ہی کھوپڑی سہلادی"

"نواب تو اچھے ہیں؟"

"اجی وہ گئے چولھے میں۔ یہاں سر پھٹا رہا ہے۔ اُف لے اب چلو تمھارے ساتھ چلیں۔ کچھ تو کھلواؤ یار۔ اسوقت مارے بھوک کے بیدم ہوئے جاتے ہیں؟"

"چلئے آئیے بسم اللہ۔ مگر واسطے خدا کے سچ کہنا ہماری گرفتاری کے لئے تو نہیں آئے ہو۔ بھائی ہم ہرگز نہ جانے کے اب یہاں اور ہی دُھن ہے"

آزاد اور خوجی دونوں مل کر چلے تو کالی گھٹا نے وہ لطف دکھایا کہ او ہو ہو ہو۔ میاں آزاد اپنے دوست خوجی کو ایک یوروپین کوٹھی میں لے گئے اور وہاں لے جاکر اتنی شراب پلادی کہ خوجی ٹین ہو گئے۔ تب میاں آزاد نے دم دبے دبے سے ان سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کہ کہاں آئے ہو۔ وہ تو اُس وقت اپنے آپے ہی میں نہ تھے۔ سب حال صاف صاف ہو بہو کہہ دیا کہ نواب نے بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میاں آزاد جہاں ہوں وہاں سے لے آؤ۔ آپ سے بہت ہی ناراض ہیں۔ تین آدمی اور میرے ساتھ ہیں۔ اب ہم آپ کو گرفتار کر کے لے جائیں گے"

یہ سنتے ہی میاں آزاد کے کان کھڑے ہوئے اور وہاں سے بھاگے تو سیدھے میاں ظراف کے گھر ہو رہے۔

دوسرے دن صبح کو میاں آزاد ظراف کے گھر سے اپنی محبوبہ حسن آرا کے یہاں پہونچے۔ کافی دیر شکوے شکایات کے بعد وہاں سے پھر میاں ظراف کے مکان پر

پہونچے تو وہاں افیونیوں کے پُشت پناہ میاں خوجی کو دیکھا کہ چانڈو کے نشہ میں غین پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بلا یہاں کہاں سے آئی۔ اے لاحول بھئی اس نے تو بے طور پیچھا کیا ہے۔ مگر اس وقت پڑا رہنے دو پھر سمجھا جائے گا۔ جوں توں رات کاٹ کر پھر وہ حسن آرا کے گھر کی طرف چلے۔ راستے میں ایک بھٹی کے قریب دو شرابیوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ کر انھوں نے کہا "خدائی خوار گدھے اسوار تم دونوں پر شیطان کی پھٹکار خدا کی مار۔ یہ وضع اور یہ جوتی پیزار۔ سر بازار تکرار اور مار دھاڑ۔ ذرا دل میں شرماؤ۔ مارے خفت کے زمین میں گڑ جاؤ"

ایک نے کہا ؎ زندان در میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہو طرف ان بے ادبوں کے"

دوسرے نے اس کو چھوڑ کر انکا پیچھا کیا۔ ان کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ایک تُنکے کے اٹھ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ میاں آزاد کی ٹوپی اُچھال دی میاں آزاد جھلائے اور وہ دونوں بھی تیش میں آئے اور لگا گدا چلنے۔ آزاد نے چپت لگائی اور دھول جمائی۔ بات تیر سے کی تڑ اور پھٹ۔ دھم اور کھٹ تڑاق اور پڑاق۔ بازار میں ہلڑ مچا ہوا تھا۔ تماشائی ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع۔

اتنے میں غل جو ہوا تو میاں خوجی پینک سے چونک پڑے۔ تراق کی لونڈی نے کہا "میاں ایسی نیند تو ج کسی بھلے مانس کو آئے۔ آزاد سے باہر گدے بازی ہو رہی اور تم یہاں خراٹے لے رہے ہو"

اتنا سننا تھا کہ میاں خوجی آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے۔ ادھر ادھر دیکھا تو لٹھ نہ ڈنڈا۔ اُنھوں نے جھپٹ سے چانڈوں کی نگالی اٹھائی اور لپکے اور لپکتے ہی غل مچایا "ابے او گیدی ٹھہر جا۔ میں آن پہونچا" شرابیوں نے جو ان پر نظر ڈالی تو واہ جی واہ کیا خوب تشریف لائے ہیں ننھے سے آدمی ایسی کمر کے برابر قد

اور یہ خم اور دم۔ انھوں نے آزاد سے اپنے کو چھڑا کر ان کی خبر لی. جھلا کر آپ نے نگالی اٹھائی۔ ایک نے نگالی چھینی اور لگا کھٹا کھٹ جمانے۔ میاں ہی کی جوتی میاں ہی کا سر۔ دوسرے نے کسی سے پوچھا نہ پاچھا جھپٹ کر میاں خوجی کو کاٹ کھایا۔ اتنے میاں آزاد نے چپکے سے اپنی راہ لی۔ خوجی بیچارے پٹ پٹا کر اٹھے کچومر نکل گیا۔ مگر واہ رے خوجی۔ پھر بھی وہی خم دم ہیں۔ وہی تیکھی چتون ماشہ بھر کا تو قد شریف مگر اکڑے ہی جاتے ہیں اور دونوں شرابیوں کو اسطرح گھور رہے ہیں جیسے کھا ہی جائیں گے. جوالی موالی حضرت کی قطع دیکھ دیکھ کر لوٹن کبوتر ہوئے جاتے ہیں۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اب خوجی ہیں کہ دنیا بھر کو گالیاں دے رہے ہیں۔ آخر کار جھاڑ پونچھ کر چل دیئے۔

لونڈی نے کہا "واہ میاں گئے تھے پیٹنے اور الٹے پٹ کر آئے۔ اتنی پڑیں بے بھاؤ کی کہ کھوپڑی گنجی ہو گئی۔ چاند پر ایک بال تک نظر نہیں آتا۔

خوجی بہت ہی جھلائے اور آگ بھبھوکا ہو کر کہنے لگے "چپ شہکارہ تو ہمیں کیا جانے. کھوپڑی گنجی کیسی۔ یہ گنجی کھوپڑی کے کیا معنے. آخر یہ تو نے کہا کیا ہماری کھوپڑی پر بال تھے ہی کب. یہاں پیدائشی ہی ایسے بال ہیں۔ اور صاف چاند تو خوش اقبالوں کی نشانی ہے"

اس نے قہقہا اڑا کر کہا "اب ہٹو بھی۔ آئے وہاں سے بڑے اقبال مند بنکر. واہ کیا اقبال ہے. صورت سے پھٹکار برستی ہے اقبال والے بنے ہیں"

خوجی دانت پیس کر رہ گئے اور بولے کہ "بس چلی جا. نہ ہوئی جوانی۔ ورنہ کھود کر اسی جگہ دفنا دیتا"

اس اثنا میں میاں آزاد حسن آرا کے گھر پہونچے. دن بھر اور رات بھر وہیں بسر کی اور تڑکے اٹھتے ہی تیاری سفر کی کہ اتنے میں میاں خوجی لڑھکتے

بڑھ ھکتے پتہ پوچھتے ہوئے آن موجود ہوئے۔ دربان سے بولے۔

"میاں ہوت۔ ذرا آزاد کو تو بُلاؤ۔"

اُسنے جواب دیا "کس سے کہتے ہو۔ آئے کہاں سے جاؤگے کہاں۔ ہو کون!"

"ایں یہ تو کچھ تقریہ یا سا معلوم ہوتا ہے۔ ابے اطلاع کردے کہ خواجہ صاحب آئے ہیں"

"ہونہہ خواجہ صاحب! ہمیں تو جولاہے سے معلوم ہوتے ہو بھلے مانسوں کی ایسی ہی صورت ہوا کرتی ہے۔

"اور نہیں تو پھر کیسی ہوا کرتی ہے"

یہ تقریر میاں آزاد نے سُنی تو خوجی کو پردے کے پاس بُلا لیا۔ خوجی بولے۔

"اجی ایک ذرا آئینہ تو بھیجدینا۔ آئینہ بھیجئے گا ذرا!"

آزاد نے کہا "یا وحشت یہ آئینہ کیا ہوگا۔ بندگی نہ سلام نہ مزاج پرسی نہ کچھ بات چیت۔ آتے ہی آئینہ یاد آیا۔ بندر کے ہاتھ میں بھلا آئینہ کون دینے لگا!"

"اجی بھیجتے ہو یا دل لگی کرتے ہو۔ دربان سے ہم سے جھوڑ ہو گئی ہے۔ اسوقت مردود کہتا ہے کہ تمھاری صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں۔ اب کوئی اس گیدی خر سے پوچھے تو پھر کیا چمار کی سی ہے یا پاجی کی سی۔ ذرا آئینہ بھیجئے میں دیکھوں تو۔ مجھے خود شک ہو گیا۔"

"بھئی اگر سچ پوچھتے ہو تو صاف صاف یوں ہے کہ تمھاری صورت سے ایک طرح کا پاجی پن برستا ہے۔ خدا چاہے پاجی بنائے مگر پاجی کی صورت نہ بنائے۔ مگر اس کا علاج کیا۔"

"واہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں آپ کے پاس۔ ڈاکٹروں نے مردے تک کے جِلا لینے کا بندوبست کیا آپ فرماتے ہیں کہ علاج ہی نہیں۔ دیکھئے ہم بتا دیں گے۔ صورت ہی بدلنی ہے۔ پھر یہ کتنی بڑی بات ہے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ایڈا بینڈا علاج ہو اور مُنھ ہی بگڑ جائے۔ اس سے تو پاجی ہی بنا رہنا چاہیے۔

"نا صاحب پاجی نہ بنیں گے۔ پاجی بن کے جئے تو کیا"

"کل ہم روم جانے والے ہیں چلتے ہو ساتھ"

"نہ چلئے اسپر بھی لعنت اور چلئے اسپر بھی" "تم تھوک کر ہم خوش ہمارا خدا خوش"

"مگر وہاں چانڈو نہ ملے گا اتنا یاد رکھیے۔

"ابجی افیم ملے گی، کہ وہ بھی نہ ملے گی بس، تو پھر ہم اپنے چانڈو بنالیں گے۔ آپ ہماری فکر نہ کیجئے۔ ہمیں لے چلیئے بالضرور لے چلیئے۔

میاں آزاد اندر سے نکل آئے۔ بات یہ تھی کہ ان کی معشوقہ مہ لقا حسن آرا نے فرمائش کی کہ روم جائیے اور ترکوں کو روسیوں کی یورش سے بچائیے۔ باہر آکر میاں خوجی سے انھوں نے صلاح لی اور کہا کیوں یار بچے اب اس وقت کیا صلاح ہے۔ آخر تم تو سن رسیدہ گرگ باراں دیدہ۔ خرانٹ فقرے باز آدمی ہو۔ تم ہی کچھ سوچو مگر وہ رائے دو کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ جاؤ اب تمھاری ہی رائے پر عمل کریں گے۔ اسی میں ہر چہ بادا باد۔"

خوجی افیمی آدمی۔ ترکی کا نام سنتے ہی ہکا بکا ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور بولے "خدا ہی خیر کرے بھئی۔ ہم سمجھے تھے کہ دل لگی کرتے ہو یہ کیا معلوم تھا کہ سچ مچ تنگ تو بڑا چڑھا کر بھاگا ہی چاہتے ہو۔ میاں تم لاکھ عالم و فاضل سہی۔ پھر لڑکے ہی تو ہو۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش آپ کی اور داعیہ یہ ترکی جا کر روسیوں سے لڑیں گے۔ اے تیری قدرت میاں ہوش کی دوا کرو عقل کے ناخن لو۔ سوجھی بھی تو کیا سوجھی بے تکی۔ یہ خیال خام پختہ مغزی کی دلیل نہیں ہے قبلہ۔ ایک ذرا سی چنے کے برابر گولی پڑے گی تو ٹائیں سے مر جائیے گا۔ آپ کو بھی

مورچے پر جانے کا شاید اتفاق نہیں ہوا۔ ارے میاں خدا بھلے مالس کو نہ لیجائے
غضب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ گولی پڑی یہ مرگیا۔ گھوڑے کی پیشانی پر جمی دھم سے گرا
دائیں وائیں کی آواز رعد کی طرح گونجتی ہے۔ قریب سپاہی کھڑا ہے اور ایک
دفعہ ہی لوٹ گیا۔ توپ کا گولا آیا اور اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا۔ گولا پھٹا اور بہتر
ٹکڑے ایک ایک ٹکڑے نے دس دس آدمیوں کو دیکھتے ہی دیکھتے اڑا دیا گویا پیدا
ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور جو کہیں تلوار چلنے لگی تو اُف او اجل سامنے نظر آتی
ہے بے موت جان جاتی ہے۔ کھٹا کھٹ تلوار چل رہی ہے اور ہزار ہا آدمی
گرتے جاتے ہیں۔ سو بھئی وہاں جانا کچھ خالہ جی کا گھر تھوڑا ہی ہے خدا کے لئے
اُدھر کا قصد کبھی کہیں نہ کرنا اور بندہ تو اپنے حساب جانے والے کو کچھ کہتا ہے۔
ارے توبہ ارے توبہ۔ خدا بھلے مالس کو جنگ کے میدان سے بچائے۔ ہم ایک
ترکیب بتائیں۔ آخر منشا تمھارا یہی ہے نہ کہ حسن آرا سے وصال ہو مگر بعد نکاح۔
اچھا منظور۔ اور ان ہی کے کہنے سے آپ ٹرکی جاتے ہیں۔ کہئے ہاں خیر تو وہ کام کیوں
نہ کیجئے کہ حسن آرا آپ کو خود روکیں اور لاکھوں قسمیں دیں کہ جائیے تو ہمارا مردہ
دیکھئے۔ آپ وہاں جا کر بیٹھئے اور ہم کو جی کے پاس بٹھائیے اور جنگ کا ذکر
چھیڑیے پھر دیکھئے میں کیسی لفاظی کرتا ہوں کہ آپ کا جی خوش ہو جائے جنگ
کی مصیبتوں کو اس پیرایہ میں بیان کروں کہ دونوں بہنیں کانپ اٹھیں اور
اُن کو یقین کامل ہو جائے کہ میاں آزاد گئے اور انٹا غفیل ہوئے اور میں
صاف صاف کہدوں گا کہ بھائی آزاد ذرا اپنی تصویر کھچوا لو۔ آخر اب جدائی کی
گھڑی تو سر پر کھڑی ہے۔ دو تین مہینے میں سن لیں گے کہ میاں آزاد نے گولی کھائی
اور دم توڑا۔ واللہ جو کہیں یہ تقریر سن پائیں تو حشر تک تمھیں نہ جانے دیں اور
چھٹ [illegible] لو۔ اور

رُوم جانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ فرض کیجئے کسی مورچہ پر گولی لگی اور لوٹ گئے پھر حسن آرا سے کون ملے گا۔ توبہ توبہ۔

میاں آزاد جب یہ داستان سن چکے تو بولے "بس اب آپ اور کچھ نہ فرمائیے گا۔ ٹرکی جاؤں اور پھر جاؤں۔ دن دہاڑے جاؤں ڈنکے کی چوٹ پر جاؤں۔ لاکھ میں جاؤں کروڑ میں جاؤں باقی رہا مرنا جینا یہ کسی کے اختیار کی بات تو ہے نہیں مورچوں پر سے لاکھوں آدمی کورے آتے ہیں اور ہزاروں راہ چلتے چلتے لوٹ جاتے ہیں۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں حسن آرا ہم سے کہے کہ ٹرکی جاؤ اور ہم اغماض کر جائیں۔ کیا مجال۔ اور پھر حسن آرا پیاری حسن آرا کو ایسا چکل دیں۔ اتنا بڑا چکل دیں۔ اُف جس کو معشوق کیا اس سے یہ فریب۔ اینجانب تو ہرگز گوارا نہ کریں گے چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ آپ میاں ظرافت کے یہاں جائیے اور اُن سے کہئے کہ ہم ابھی آتے ہیں۔ آج ہی سفر کا عزم ہے سب سامان درست کر رکھیں ہم پہونچے اور کھانا کھایا اور چلتے ہوئے"

خوجی تو گر۔ تر پڑتے چلے۔ مگر دو قدم جا کر پھر پلٹے "آزاد میاں آزاد بھائی ایک بات سُنتے جاؤ۔ کیا ہم کو بھی آپ کے ساتھ ہی جانا ہوگا۔ اگر لے چلو تو خیر ہم بھی ہمراہ رکاب چلے ہی چلیں۔ لیکن واسطے خدا کے ذری صورت تو دکھا دو"

آزاد نے للکارا "دور ہو نامعقول یہاں اسوقت کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہے"

خوجی پھر اُلٹے پاؤں بھاگے مگر دو چار قدم کے بعد پھر پلٹ پڑے "میاں آزاد۔ میاں آزاد۔ ارے بھائی آزاد ہوت ذرا سُنتے جاؤ"

میاں آزاد کی جان عذاب میں کہ اچھے دیوانے سے پالا پڑا پلٹے "کہو اب کیا یاد آیا۔ یار تم نے تو ناکوں دم کر دیا۔

خوجی بولے "اُستاد ایک بات بھول گئے تھے کھانا پکوا رکھیں ساتھ

لے چلئے گا یا نہیں"

آزاد بہت ہی جھلّائے اور للکار کر کہا "نامعقول یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا جو اتنی دور سے ملیٹے۔ جاؤ۔ ابکی بگاڑوگے تو گلا ہی گھونٹ ڈالوں گا۔

خوجی بیچارے اپنا سا منھ لیکر رہ گئے اور الٹے قدمے جانے لگے۔ ظرافت کے گھر پر جو وہاں سے کوئی ڈیڑھ میل تھا سوا تین گھنٹے میں پہونچے اور پہونچتے ہی غل مچانا شروع کیا" جلدی تیاری کرو۔ میاں آزاد ابھی ابھی آنے والے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ایک پانچ سیر میٹھے ٹکڑے اور سات سیر استعمالی اور چار سیر بلکہ تین سیر والے چاول کا پلاؤ۔ اور دس سیر فیرنی اور دس ہی سیر کھیر اور کوئی چودہ سیر زردا اور کوئی پانچ سیر مربّی اور میٹھے اچار کی دو اچاریاں یہ سب سامان جلد تیار ہو رہے "

خوجی نے کہی بھی تو اپنے ہی مطلب کی۔ افیونی آدمی سب میٹھی ہی میٹھی چیزیں بتائیں اور طرہ یہ ہے دس سیر اور پانچ سیر سے کوئی کم نہیں۔ خیر میاں ظرافت کی بیوی تو کھانا پکانے میں طاق تھیں۔ اور گھر کی لونڈیاں بھی براق تھیں۔ معاً سب انتظام کر لیا اور ہاتھوں ہاتھ سامان ہوا۔

میاں آزاد بھی ظرافت کے گھر پہونچے۔ ظرافت نے کہا "کھانا تیار ہے کہئے تو نکلوایا جائے۔ برف بھی منگوا رکھی ہے "

آزاد نے جواب دیا "کھانا تو اس وقت ہم نہ کھائیں گے اشتہا نہیں مطلق بھوک نہیں "

"ایں! کیا خوب۔ پھر اتنا پکوایا کیوں۔ ابھی دو نوالے تو کھا لو "

"پکوایا کس نے مجھے تو صبح سے کھٹی ڈکاریں آ رہی ہیں۔ یہ آپ سے کہا کس نے تھا کہ آپ کھانا پکوائیں "

"اور سُنیئے گا۔ کہا کس نے ایک ہی کہی۔ کہا آپ کے خوجی نے اور کس نے۔ بولو میاں خوجی دس سیر فیرنی اور دس سیر کھیر اور اٹھارہ سیر میٹھے ٹکڑے اور خدا جانے کیا اَلم غَلم بتا گئے۔ گھر میں بڑے اہتمام بلیغ سے سب سامان لیس کیا اب وہ چار نوالے تو آپ کو ان کی خاطر سے ضرور کھانے چاہئیں"

"لاحول ولا قوۃ۔ خوجی بھی بس گرسنہ چشم ہی رہے"

خوجی بولے "لاحول کاہے کی۔ آخر اس لاحول کے کیا معنے۔ آپ نہ کھائیے بندہ تو ڈٹ کے چکھ چکا"

آزاد نے پوچھا "کیا یہ کھانا کھا چکے"

"جی نہیں تو کیا آپ کی طرح بیوقوف ہوں۔ اور سب میٹھی میٹھی چیزیں پکوائیں۔ آج افیم بھی معمول سے زیادہ پی خوب چسکی لگائی اور تنجن پر ہاتھ لگائے"

"بس اب بوریا بندھنا اٹھائیے۔ چلئے بسم اللہ کر کے لدیئے پھندیئے"

"قبلہ اب تو اس وقت یہ حال ہے کہ جیسے چوہے کو کوئی پارہ پلا دے چلنا چلانا معلوم۔ اب بندہ لوٹ مارے گا اور سواری کیا ہے"

ظرافت نے کہا۔ "یکہ"۔

خوجی بولے "ارے غضب خدا کا۔ بندہ تو جا چکا۔ یکے پر تو آجتک کبھی سوار ہی نہ ہوئے اینجانب اور پھر کھانا کھا کے ارے توبہ مر ہی جاؤں گا۔ کبھی ذرا سا پانی پلانا۔ یار افیمی تو بہت دیکھے مگر سچ کہنا ایسا بھی کوئی دیکھا جو پینک کا نام بھی جانتا ہو"

الغرض میاں آزاد نے جھٹ پٹ کھانا کھایا اور اسباب وسیاب کس کر آمادہ سفر ہوئے۔ خوجی کو بھی ایک لات جمائی "اُٹھ نامعقول! بس اب سونا دونا ہو چکا" قہر درویش بر جان درویش کہہ کر اُٹھے باہر جا کر دیکھتے ہیں تو ایک سمند گھوڑی کھڑی پدری۔ دوسرا ایک ٹٹو۔ پوچھا یہ گھوڑی گھوڑا کس کے لئے آئی ہے۔ مگر یہ پیگھو گا

ٹانگھن کیا قدم باز اور سبک خیز ہے" آزاد سمجھ گئے کہ ہمیں اُلّو بنانا چاہتا ہے۔ شان خدا! اے تیری قدرت۔ میاں خوجی بھی اتنے ہوئے۔ سمند گھوڑی ڈھائی سو روپیہ قیمت کی اس کو آپ ڈگی بتاتے ہیں جس میں میری نظروں سے گر جائے اور اُس دُبلے پتلے مریل ٹٹو کو پیگو کا ٹانگھن بتاتے ہیں۔ آزاد نے مسکرا کر کہا "پھر یہ پیگو کا ٹانگھن آپ ہی کو مبارک رہے بندہ اسی ڈگی پر قناعت کرے گا"

اب سُنئے کہ میاں خوجی نے اپنے مریل ٹٹو کو جو دیکھا تو لگے دو ہتڑ پیٹنے "یارو واسطہ خدا کا ہمیں بچالو۔ بھئی ہم ایسے جانے سے درگذرے۔ بلّی بخشئے چوہا لنڈورا ہی ہو کر جئے گا۔ پیچ پی ہزار نعمت پائی"

آخر کار لوگوں نے للکارا کہ بیوقوف ہوا ہے مرا کیوں جاتا ہے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ سوار ہو جائیں لیکن یار لوگ ڈراتے ہیں کہ دیکھ دیکھ وہ پشتک اچھالی۔ وہ دولتی جھاڑی وہ کاٹنے دوڑا۔ وہ منھ کھول کر لپکا۔ وہ دبوچا۔ وہ ٹیٹوا لیا" وہ ٹٹو کھڑا ہے کان تک نہیں ہلاتا۔ ایک دفعہ ہی آنکھ بند کر کے حضرت نے چاہا کہ لدیں مگر یاران سرپل نے تالیاں جو بجائیں تو ٹٹو بھاگا اور میاں خوجی بھد سے زمین پر "اُف دیکھا کہتے تھے نہ ہم اس ٹٹو پر سوار ہوں گے۔ مگر حضرت ذات شریف نے دو گھڑی دل لگی دیکھنے کے لیے ہم کو اُلّو بنایا۔ کچومر ہی نکل گیا ہڈی پسلی بچ گئی ورنہ کچومر ہی ہو جاتے"

خیر دو آدمیوں نے اُن کو اُٹھایا اور لاد کر گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ لگام اُن کے ہاتھ میں دی اور کہا ٹخ ٹخ۔ لگام اُنھوں نے لی ہی تھی کہ ایک بگڑے دل نے چابک جمایا اور ٹٹو دُم دبا کر بھاگا اور میاں خوجی نے غل مچایا "ہرا ہرا گرا گرا یا علی مشکلکشا مشکل کشائی کیجئے یا خدا مدد دیجئے۔ الٰہی خیر کیجیو" ارارا دوں دھم۔ وہ میاں لڑھک گئے۔ تب تو میاں آزاد نے [illegible] اور ظرافت سے

رخصت ہوکر خوجی کی مدد کو چلے۔ اُن کو جو حوالی موالی بازاری تماشائیوں نے
دیکھا تو کھسکے اور خوجی ٹٹو پر لدے ہوئے آہستہ آہستہ چلے۔

خوجی نے آزاد سے پوچھا "اب کیا اُدم تک برابر اسی ٹٹو پر ہی جانا ہوگا؟"

"جی ہاں اور نہیں تو کیا۔ اور کیا آپ کے واسطے اُڑن کھٹولا آئے گا۔"

"بندہ رخصت ہوتا ہے"

"بندہ گدا دیتا ہے"

"بھلا اس ٹٹو پر کون جائے گا"

"ٹٹو! اے آپ تو اس کو بیگو کا ٹانگھن کہتے تھے"

"بھئی للہ ہمیں آزاد کرو۔ ہم درگزرے۔"

"ارے بے وقوف۔ لکھنؤ تک یوں ہی چلنا ہوگا۔ وہاں سے پھر ریل ہے
بمبئی تک ریل پر جائیں گے اور وہاں سے جہاز؟"

خوجی نے غل مچایا "کیا! جہاز! اُف میرے مولا پانی کا سفر ہو کس سے
سکے گا۔ اور وہاں افیون کہاں ملے گی۔ جر سے یہ موت بھائی ہمیں آزاد کرو۔"

"بس چلتے چلو" آزاد نے کہا۔

(٢)

میاں آزاد اور ان کے لنگوٹیے یار میاں خوجی گھوڑوں کی باگ اُٹھائے
چلے جاتے تھے۔ میاں خوجی کی ٹٹوی بھی گربائی تو آزاد کی سمند گھوڑی سے دس
پانچ ہی قدم پیچھے رہنے لگی۔ چلتے چلتے شام کے وقت ایک گاؤں نظر آیا۔
میاں آزاد نے کہا "بستر یا آج یہیں [illegible] کل یہاں سے لکھنؤ داخل

ہو جائیں گے"۔ رات بھر وہاں رہے۔

صبح تڑکے گجر دم پھر چلے تو کوئی تین ہی چار کوس گئے ہونگے کہ میاں خوجی ادہر کے کھیت میں گئے اور ٹٹوی کو راہ خدا پر چھوڑ دیا کہ جہاں جی چاہے آزادی سے چرے۔ ٹٹوی دیکھنے میں تو دُبلی پتلی تھی صورت حرام مگر انتہا کی شریر۔ یہ تو ادہر کے کھیت میں ہو رہے۔ وہ سیدھی چلکے بوٹ کے کھیت میں پہونچی اور لگی چبنے اتنے میں کسان نے جو دیکھا تو لٹھ لے کر دوڑا اور لگا بُرا بھلا کہنے۔ اس کی جورو بھی چمک کر لپکی اور کوسنا شروع کیا" پلوٹیا مرجائے۔ پلوٹیا کے کیڑے پڑیں۔ ابھی ابھی پیٹ پھٹے۔ ڈاڑھی جار کی لہاس نکلے۔

اور کسان نے گالیاں دیں" ارے یو ٹٹو کس سار کے آئے سُسُر ہمرے کھیت میں بیٹھا دہیس"۔

میاں خوجی جو باہر نکلے تو دیکھا کہ ٹٹوی بھاگی جاتی ہے اور پیچھے پیچھے کسان کی جورو غل مچاتی ہے اور کسان لٹھ لئے ہوئے چلا آتا ہے۔ اس نے گد سے لٹھ جمایا اور پھر تان کر دوسرا دیا اور پھر تیسرا چھپانے ہی کو تھا کہ میاں خوجی نے للکارا" او گیدی۔ ابے او گیدی۔ خبردار اس حرکت ناشائستہ سے باز آ ورنہ فرق دان پر ایک بال نہ باقی رہے گا اور ضربت پاپوش سے بوکھلا جائے گا"۔

وہ گنوار بلکہ اور گنوار کا لٹھ عربی ترکی پڑھا نہ تھا۔ اسپر جھلا کر جھپٹ پڑا اور اتنے لٹھ رسید کئے کہ ٹٹوے کے پُنھتر بگڑ گئے۔ میاں خوجی میں ایک وصف تھا کہ بے سوچے سمجھے بے دیکھے بھالے لڑ پڑتے تھے چاہے اپنے سے دوگنا چوگنا ہو یہ چمٹ ہی جائیں گے۔ غصہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا ہے کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا غصہ بھی نرالا تھا۔ ان کو جب غصہ آتا تھا تو شہ زور پر جو ان کو اُٹھا کر پھینکے تو اٹھارہ گرہ سکیں یا اُٹھائیں چاہے کچومر نکل جائے مگر یہ دم نہ ماریں پھولتے

دوسرا وصف یہ تھا کہ پٹ پٹا کر جھاڑ پونچھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے مگر ممکن کیا کہ ذرا اُف کریں۔ وہی تیور۔ وہی خم وہی دم۔ کسان نے اتنی بڑی گستاخی کی ان کے حضور میں کی کہ ان کی ٹٹو ہی کو ان کے سامنے اتنا مارا کہ اس کا بھرکس ہی نکل گیا۔ پھر بھلا ان کو تاب کجا۔ آفتابہ پھینکا اور تڑسے دوڑ کر کسان سے گتھ گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا کرارا۔ یہ منحنی دبلے پتلے جھینُ آدمی۔ ہوا کے جھونکے میں اُڑ جائیں اس نے ان کی گردن دبوچی اور گد سے زمین پر ٹپکا۔ پھر بھلینڈے کی کوشش کی تو کسان کی جورو ان سے چمٹ گئی اور لگی ہاتھا پائی ہونے سے اس نے ایک گھونسا جمایا اور ان کے پٹے پکڑ کر پھینکا تو چاروں شانے چت۔ دو تھپڑ رسید کئے ایک اِدھر اُدھر اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے کہ "بھرا وے جیت پاوت ناہیں یو منڈے سے لڑیبے لے بھلا"

کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چل دی آپ نے پکارنا شروع کر دیا "قسم باباجان کی جو کہیں چھُرا پاس ہوتا تو ان دونوں کی لاش اس وقت پھڑکتی ہوتی۔ وہ تو کہئے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میں اپنے زعم میں آپ آ رہا ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ ہات تیرے کی نابکار لعین۔ کھڑا تو رہ او گیدی دوڑ گئی!"

اسپر گاؤں والوں نے تو بے تحاشا قہقہہ اُڑایا اور اتنا بنایا کہ میاں خوجی جھلا کر سب کو گالیاں دینے لگے" او گیدی تم سب پر میں بھاری ہوں پر مرے کے پرے صاف کر دوں۔ وہ تو کہئے کہ چھُری نہ ہوئی اس سے خیریت ہے" ایک راہگیر نے پوچھا "کیوں میاں صاحب چھُری ہوتی تو کیا بھونک کر مر جاتے یا اپنے پیٹ میں تکاتے آخر نتیجہ کیا ہوتا" اسپر میاں خوجی اور بھی آگ بھبھوکا ہو گئے

میاں آزاد کوئی دو گولی کے ٹپّے پر نکل گئے تھے۔ جب خوجی کو ساتھ نہ دیکھا تو حیرت ہوئی کہ ایں، یہ کہاں رہ گئے۔

"کیوں جی" ایک مسافر سے پوچھا "کیوں جی پیچھے کوئی شخص ٹٹو پر سوار آتا دیکھا"

اُسنے کہا "جی ہاں ایک کسان سے لڑائی ہو رہی تھی اور اُس کی جورو نے اُن کو خوب مارا وہ کھیت میں پڑے قرولی ڈھونڈ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرولی ہوتی تو مار ہی ڈالتا"۔

میاں آزاد نے گھوڑی پھیری اور دم کے دم میں ہوا ہو گئے۔ ٹو کھٹ سے اس کھیت میں داخل۔

"ارے میاں خوجی" آزاد نے پوچھا "خیریت تو ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے یہ یہاں کھیت میں پڑے رہنے کا سبب کیا۔ چلو اُٹھو گرد جھاڑو آخر کب تک پڑے رہو گے بھلا"

"قرولی نہ ہوئی پاس ورنہ اسوقت دولاشیں یہاں پھڑکتی ہوئی دیکھتے"۔

"اجی وہ تو جب دیکھتے تب دیکھتے۔ بالفعل تو تمھاری لوتھ دیکھ رہے ہیں۔ پھر تو تھمبو کر کے اُٹھایا اور گھوڑی پر سوار کرایا۔ چلے تو تھوڑی دور تک میاں آزاد کا ساتھ رہا بعد ازاں کوئی ایک کھیت کا فاصلہ ہو گیا۔ خوجی سے ایک پٹھان نے پوچھا "کیوں شیخ جی آپ کہاں رہتے ہیں" حضرت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ایک کوڑا اچھالا اور کہا "ابے ہم شیخ نہیں خواجہ ہیں"۔ وہ شخص غصّے سے آگ بھبھوکا ہو گیا اور ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تو خوجی کھٹ سے زمین پر۔ چاہا کہ اُن کو گلا گھونٹ کے مار ڈالے مگر رحم آیا اور چھوڑ دیا کہ مفت کا خون کون اپنی گردن پر لے۔

اب اُن کی شیخی کرکری ہو گئی، چپ چاپ دونوں کے پیچھے پیچھے چلے، آزاد نے

جو پیچھے پھر دیکھا تو ٹٹو کی پو قدمی چلی آ رہی ہے مگر خوجی ندارد۔ سمجھے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ پلٹے کہ دیکھیں اب کیا واقعہ ہوا۔ خوجی ٹٹو کی پر سے گر کر حسب معمول غل مچانے لگے کہ نہ ہوئی قرولی ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ یاد ہی کرتا عمر بھر آزاد گھوڑی کو کڑکڑاتے ان کے کلّے پر جا ڈٹے تو دیکھا کہ پھر اسی طرح زمین پر پڑے ہوئے قرولی کی جستجو میں ہیں۔ آزاد نے کہا:

"اے پھٹکار شرم نہیں آتی۔ کمزور مار کھانے کی نشانی۔ بدن میں سکت نہیں تو پھر کٹے کیوں مرتے ہو۔ مفت میں جوتیاں کھانا کون جوانمردی ہے؟"

"واللہ آزاد قرولی کہیں پاس ہو تو بدن ہی چھلنی کر ڈالوں دم تو لینے نہ دوں۔ مگر چلئے بخیر گذشت۔ ورنہ اس وقت گیدی کی تجہیز و تکفین کی فکر پڑ تی۔"

"چلو اب اٹھو۔ اٹھو گے بھی یا برسوں تک یہاں ہی پڑے رہو گے۔ یار تم نے تو اچھا ناک میں دم کر دیا۔ اب یار اسی کے ہو رہے کہ تم کو ڈھونڈنے نکلیں!!"

"اجی ہم نہ اٹھیں گے تا وقتیکہ قرولی نہ لادو۔ بس اب بنا قرولی کے نہ بنے گی" آزاد نے دھپ لگا کر کہا "بس اب بیہودہ نہ بکو۔ اٹھو ورنہ ایک لات بھی جماؤں گا۔"

الغرض میاں آزاد اور میاں خوجی پھر راہ چلے۔

میاں آزاد آج کچھ تھکے بہت ہیں۔ واللہ عالم کیا سبب ہوا طبیعت ہی تو ہے۔ میاں خوجی چانڈو پینے گپ اڑانے خوشامد کرنے کے عادی۔ ان کو یہ تاب کہاں کہ منزلوں ٹٹو پر جائیں۔ سفر کی صعوبت کون سہے دو دن جو منزلوں چلنا پڑا تو بول گئے اور اپنے آقا کہ بس ہی نکل گیا۔ ... کہ کہتا ہے۔ ...

عضو عضو ٹوٹ رہا ہے۔ میاں آزاد اور خوجی دونوں باتیں کرتے ہوئے بڑھے جارہے ہیں۔ آزاد نے کہا "آج طبیعت ازبس علیل ہے انتہا کی بےلطف ہے"
خوجی نے جواب دیا "یہاں جوڑ جوڑ میں درد ہے۔ اور تو خیر لڑائی ہوئی ہے مگر اس کسان کی مسنڈی عورت نے تو واللہ کچومر ہی نکال ڈالا۔ اُف کس بجر کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ مگر قسم ہے خدائے پاک کی جو کبھی کہیں چھری یا قرولی پاس ہوتی تو غضب ہی بپا ہو جاتا۔ ایک کو جیتا چھوڑتا نہیں"
"خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔ قرولی کی تو آپ کو ہمیشہ ہی تلاش رہی مگر جب آئے پٹ ہی کے آئے۔ جوتیاں ہی کھائیں۔ لیکن بُرا نہ چھوڑا۔ بس انتہا کی بےحیائی ہے۔ مرد خدا ذرا تو دل میں شرما۔ بےشرمی بھی تو کتنی کچھ ٹھکانا ہے۔ خیر یہ دھڑکا اب کوئی کہاں تک رہئے۔ یہ بتاؤ کہ آخر اب ہم کریں کیا۔ طبیعت ازبس بےلطف ہے اور جی متلاتا ہے ڈاک لگی ہے اور بند بند ٹوٹ رہا ہے۔ آنکھیں بھی جلتی ہیں اور قلب کی حالت ناگفتہ بہ ہے"
"پیش خیمہ آگیا اُستاد۔ بس آگیا اب حضرت بھی کوئی دم کے دم میں دن سے دھڑ دھمکیں گے"
"کیا پیش خیمہ کیسا اور حضرت کون۔ میں کچھ سمجھا وجھا نہیں ذرا بتاؤ تو"
"ابھی صاحبزادے ہیں نہ آپ۔ اجی آئے کون۔ بخار۔ تپ۔ احتراق۔ التہاب اور پیش خیمہ یہی اعضا شکنی آنکھوں کی سوزش کلیجہ کی دھڑکن ہے۔ اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر منزل چلنا ازبس مضر ہے۔ تم ابھی صاحبزادے ہو یہ کیا جانو۔ ہم خرانٹ ہو گئے ہیں۔ اب آپ گھوڑے پر سے اُتر پڑیے اور کسی گاؤں میں چل کر لیٹ رہیئے ورنہ طبیعت اور بھی بےلطف ہو جائیگی۔ آپ کہنا مانئے۔ عارضہ کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی ہانسی ٹھٹھا سمجھ لیا ہے آپنے کیا"

"پھر کبھی اُتر کہاں پڑ دوں۔ جب کوئی گاؤں نظر بھی آوے۔ یار اب طبیعت میں انتشار اور کبھی بڑھتا جاتا ہے اور ناکوں دم آگیا ہے۔ اُف یہ دن بھر بھٹو تک دیا۔

تھوڑی دور آگے چلے کہ ایک مسافر آتا دکھائی دیا۔ خوجی نے اُس سے کہا "کیوں میاں مسافر یہاں سے بستی کتنی دور ہے کوئی گاؤں بھی رستے میں پڑتا ہے یا نہیں؟"

مسافر نے جواب دیا "یہاں سے! یہاں سے کوئی دیکھئے وہ کوئی ڈیڑھ کوس بلکن کوس بھر پر ایک گاؤں ہے۔ کمولا وہ سامنے باغ سوجھتا ہے ان درختوں کی آڑ میں سامنے سیدھ پر"۔

خوجی بولے "لو بھئی۔ مار لیا ہے۔ کوس بھر بستی ہے بس کچا کوس۔ چلو خدا کا نام لے کر۔ اب سامنے ہی ہے اور جو کہنا مانو تو ذرا گھوڑی کو تیز کر دو دم کے دم میں داخل نہ ہو جاؤ تو سہی۔ اک ذرا سا کہ کڑا دو۔ بس پھر مزے سے لیٹنا ہے"

آزاد نے سمند گھوڑی کو ذرا تیز کیا تو وہ اُڑ گئی۔ یہ جا وہ جا۔ میاں خوجی نے بھی کوڑے پر کوڑا جمانا شروع کیا۔ سڑاپ سڑاپ ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ۔ ٹٹوہی بھی بے دم ہو کر چلی مگر پھر لد دٹٹوہی ہی تو تھی کہاں تک جاتی۔ وہ بھی گھوڑی کوئی چار سو روپیہ کی اور پھر جوان یہ بڑھیا لاکھ دوڑی لیکن وہ ہوا ہی ہو گئی۔ میاں خوجی نے جھلا کر جو ایک ایڑ دی تو ٹٹوہی بگڑ کھڑی ہوئی اور جھپٹی تو میاں خوجی سنبھل نہ سکے۔ ران کا جمنا مشکل ہو گیا اور دھڑ سے زمین پر آرہے تو بڑے ہی خفا بولے "ہات تری ٹٹوہی کی دم رسا نہ ہوئی قرولی اس وقت پاس ورنہ اتنی بھونکتا کہ بلبلانے لگتی" اتنے میں ٹٹوہی نے چاہا کہ سپاٹو کی ہوا کھائے تب تو حضرت نے للکارا "او گیدی۔ او گیدی سنبھل میں آن پہونچا" یہ سوچے کہ اگر آج بھی سڑک پر لیٹا رہا تو آزاد واپس آنے سے رہے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ٹٹوہی کو پکڑا اور لد کر چلے۔

الغرض میاں خوجی گرتے پڑتے پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں آزاد گھوڑی

پھکڑے ہیں اور سامنے سرا کا دروازہ ہے لیکن چہرہ سے ایک اضمحلال پایا جاتا ہے اور انتہا کی وحشت برستی ہے۔ ٹٹو پر سے اتر کر میاں خوجی نے پوچھا "آئیے سرا میں تشریف لائیے!"

آزاد نے کہا "بھائی تم جا کر کوٹھری وو ٹھری تو ٹھہراؤ میں ابھی آیا کچھ دیر تھوڑا ہی لگے گی لیکن کوٹھری صاف ہو اور بھٹیاری بڑھیا جس میں کام اچھا کرے اور ٹرائے نہیں۔ میں اب انتہا کا ضعیف ہو گیا ہوں۔ ناز اٹھانے کی طاقت کہاں"

خوجی سرا میں جا کر کوٹھریاں دیکھنے لگے۔ سرا بھر میں چکر لگائے لیکن کوئی کوٹھری پسند نہ آئی۔ بھٹیاریاں پکار رہی ہیں کہ "میاں مسافر ادھر آؤ ادھر۔ دیکھو خاصی صاف ستھری کوٹھری ہے۔ ٹٹو باندھنے کی جگہ الگ!" اتنا کہنا تھا کہ میاں خوجی آگ ہو گئے۔ ٹٹو کی پھیر کر کہا "کیا! پھر تو کہنا ٹٹو کی ہشت۔ یہ پیگو کا ٹانگھن ہے۔

ایک بھٹیاری نے چمک کر کہا "اے میاں ادھر آؤ پیگو کے ٹانگھن کو ادھر باندھو۔

دوسری مسکرا کر بولی "اے پیگو کا ٹانگھن ہو یا خراسان کا گدھا ادھر آؤ تو۔ یہ جھلانے لگے اور جب ان سب نے مل کر خوب بنایا تو چھری اور قرولی کی حضرت کو تلاش ہوئی۔ اس پر سرا بھر کی بھٹیاریاں تالیاں بجا بجا کر بنانے لگیں تب تو میاں خوجی چکرائے کہ تو یہ ہی بھلی۔ اتنے دق ہوئے کہ ٹٹو سی کو انھوں نے وہاں سے خیز کیا اور سرا کے باہر نکل آئے۔

باہر جو آئے تو آزاد نے پوچھا کہو جگہ ہوئی تو آپ فرماتے کیا ہیں "نہ بھئی چلو آگے کے گاؤں میں رہیں گے یہاں سب کے سب شریر ہیں؟"

"ارے کمبخت" آزاد نے جھلا کر کہا "وہ شریر ہوں یا نیک اس سے کیا واسطہ یہاں خیال یہ ہیں آتی ہے۔ آپ کو دل لگی ہاتھ آئی ہے۔ واسطے خدا کے کوئی

کوٹھری تجویز ہو۔ یا تم پڑو اپنی ایسی تیسی میں۔ میں خود جاتا ہوں"

یہ کہکر میاں آزاد سرا میں داخل ہوئے۔ اِدھر اُدھر گھوم گھام کر ایک کوٹھری تجویز کی اور اتر پڑے۔ میاں خوجی نے ٹٹو ہی پر سے زین پوش اتارا اور بستر جمایا۔

اب سُنئے کہ سائیس پیچھے رہ گئے تھے۔ میاں خوجی اپنے ہاتھ سے سب کچھ کرنا پڑا۔ سرا والے سمجھے کہ یہ سائیس ہے ایک بھٹیارے نے کہا "او سائیس بھیا ذرا گھوڑی کو ادھر باندھو"

خوجی نے گردن پھیر کر پوچھا "کس سے کہتا ہے بے۔ اب سائیس کون ہے"

بھٹیارا بولا "اور کون ہے؟"

اور بھٹیاری نے ٹکڑا لگایا "اے تو تنکتے کیوں ہو میاں۔ سائیس نہیں مگر اس گت ہی کے سہی"

آزاد نے کہا "یہ کیا بیہودہ تقریر ہے۔ یہ ہمارے دوست ہیں یا سائیس؟"

"سچ دوست ہیں۔ صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں"

"آزاد۔ یار ایک آئینہ تو نکال دینا مجھیں واللہ کئی آدمی کہہ چکے ہیں۔ مجھے کئی بار اپنے شریف ہونے کا خود شک ہو گیا آج میں ضرور دیکھوں گا بالضرور دیکھوں گا۔ آخر وجہ کیا کہ جو دیکھتا ہے یہی کہتا ہے"

"چلو واہیات نہ بکو۔ اُف میرا تو بُرا حال ہے بھئی"

بھٹیاری نے چارپائی بچھا دی اور میاں آزاد لیٹے تو بخار کی شدت کہ الاماں آنکھیں جل رہی ہیں اور بے چینی اور بیقراری بڑھتی جاتی ہے بھٹیارے نے کہا "ایک حکیم یہاں رہتے ہیں کہو تو لپک کر بلا لاؤں"

"جا کر [illegible] ہو گا [illegible] اس وقت [illegible] کچھ بک رہا ہوں"

بی بھٹیاری جاکر بلالائیں۔ میاں آزاد دیکھتے ہیں تو عجب قطع کے آدمی۔ دھوتی لگائے۔ میرزائی پہنے اور وہ بھی گاڑھے کی بند کھلے ہوئے۔ چہرے سے وحشت برس رہی ہے۔ آدمیت چھو ہی نہیں گئی۔ معقول اچھے حکیم ہیں۔ ایسے طبیب دیکھے نہ سُنے۔

آزاد نے کہا "حکیم صاحب آداب"۔

حکیم بولے "ناہیں دبواؤ ناہیں۔ تِھارییں وا بے نکسان ہے"

آزاد نے اپنے دل میں کہا "معقول۔ لیاقت ظاہر ہے۔ ہم کہتے ہیں آداب وہ کہتے ہیں دباؤ نہیں" اور پھر حکیم سے پوچھا "آپ کا اسم شریف"۔

"ہمارا اسم سریف۔ دانگلو"

آزاد ہنس پڑے اور کہا "بہت ہی خاصے دانگلو یا جانگلو"۔

خوجی سے نہ رہا گیا بولے "ہیچ نمیدانند۔ فہمیدی برادر۔ ایں گیدی ہیچ نمیداند باللہ کہ اگر قرولی بدست بابودے سرش از تن جدا کردے۔ وشل بھٹا اُڑا دیتا"۔

آزاد نے خوجی کو ڈانٹا "چلئے بس بہت فارسی کی ٹانگ نہ توڑیے معلوم ہے۔ آپ بڑے محقق طوسی ہیں"۔

حکیم نے پوچھا "نسخہ لکھوں؟"

آزاد نے کہا "آپ نسخہ وسخہ رہنے ہی دیں۔ بس یہاں سے تشریف لیجائیں"۔

حکیم نے رائے دی "ہِھاریں نکت ہیں چاند کے نیچے ننک، ننک کترواڈالو"۔

خوجی جھلا اُٹھے اور بولے "کچھ بیدھا تو نہیں ہوا ہے۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ توند پر رکھ دیتا۔ ننے کترنا کیسا۔ کیا کچھ پاگل ہیں یہ۔ جانا معقول"۔

حکیم بولے "بھائی ہم سے ان کا علاج نہ ہو سکیہے۔ اب پاگل ہو تو علاج کریں۔ یہاں یو پاگل تو ہے۔ جو ہم کا الٹی کا پلو ا لیکت ہے۔۔۔"

خوجی نے جھلا کر ان کو اٹھا دیا اور یہ نسخہ لکھا۔

ہوالشافی۔ آلو بخارا۔ تمر ہندی۔ عرق گاؤ زبان۔ شب در آب خیسانیدہ
[illegible] دانہ ۳ ماشہ

صبح مالیدہ صاف نمودہ بنوشند۔

اس نسخہ کو میاں خوجی نے پنساری کی دکان پر بھیجا۔ ادویہ بندھ کر آگئیں اور خوجی نے ان کو بھگو دیا۔ آزاد نے کہا "ذرا ہم بھی تو نسخہ دیکھیں" دیکھا بدد ماغ ہو گئے بولے "شب در آب خیسانیدہ صبح مالیدہ صاف نمودہ بنوشند معقول رات بھر میں تو اپنا کام تمام ہی ہو جائے گا۔ صبح تک جئے گا کون۔ ابھی اسوقت پلاؤ۔ اسی دم۔ جب جانیں کہ ہاں آرام ہوا۔ کل تک زندہ رہنا محال یہاں جان کے لالے پڑے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ صبح مالیدہ صاف نمودہ بنوشند"

"پھر اب اس وقت بندہ کچھ نہ دینے گا۔ ہرگز نہ دونگا واللہ ہاں ایک بات ہے۔ آلو کا پانی پیجئے پانچ دانے بھگوئے دیتا ہوں جب مانگو آب زلال دوں۔ بس کافی ہے"

"خیر یوں ہی سہی مگر یار۔ اُف پھونک دیا پھونک دیا۔ آخر یہ ہوا کیا سمجھ میں اتنا ہی نہیں اور بھوک کے مارے اور بھی جان عذاب میں ہے"

"کھانا اس وقت کیسا"

"واہ کھانا نہ دو ہو تو بندہ آپ تک کو چٹ کر جائے اس بھروسے بھی نہ رہئے گا۔

"واللہ ایک دانہ بھی آپ کے پیٹ میں گیا اور آپ برس بھر تک یوں ہی پڑے رہے۔ کھانا اسوقت سم کا اثر دیگا۔ لاحول ولا قوۃ کھانا؟ اُف نام نہ لو"

"خیر آلو کا آب زلال تو لائیے"

"لو جرعہ جرعہ پینا۔ یہ نہیں کہ پیالے کو منہ سے لگایا اور غٹ غٹ نوش جان کر گئے۔ [illegible]"

"اُف ذرا تسکین ہوئی اور پیوں گا"

"ابھی نہیں ذرا تھم کر۔ ذرا دم تو لو۔ بخار میں زیادہ پینے سے طحال کے بڑھنے کا خوف ہے"

"قلب کی حرارت کیونکر رفع ہوگی"

"ہم بتائیں۔ صندل اور کیوڑے کی پتی قلب پر رکھیئے۔ ابھی تخفیف نہ ہو تو سہی"

"جی گھبراتا ہے"

"بخار میں یہ تو قاعدہ ہی ہے۔ جی ضرور گھبرائے گا یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ مگر ذرا استقلال بھی رکھیئے"

"علاج تک مضائقہ نہیں مگر مار نہ ڈالنا بھائی۔ ہاں ذرا اتنا احسان کرنا"

"واہ ہم نے برسوں مرزا محمد علی سرور کے یہاں مطب کیا ہے"

میاں آزاد رات بھر بے چین رہے طبیعت بگڑتی گئی۔ میاں خوجی گو طبیب نہ تھے مگر اطبا کی آنکھیں ضرور دیکھی تھیں۔ انھوں نے مسکنات اور مبردات کا خوب استعمال کرایا۔ اس سے کرب کسی قدر کم ہوا اور میاں آزاد کی آنکھ لگ گئی کہ دفعتہً پڑوس کی کوٹھری سے آواز آئی کہ لا شراب لا شراب۔ یہ چونک پڑے خوجی سے پوچھا "خیر ہے"

انھوں نے کہا "جی ہاں فضل الٰہی ہے مگر افسوس کہ اسوقت قرولی پاس نہیں ورنہ ان بدمعاشوں کو قتل ہی کر ڈالتا۔ مردودوں نے شراب پی پی کر اس قدر غل مچایا کہ الاماں ابھی تمھاری آنکھ لگی تھی اور خدا خدا کر کے ذرا نیند آئی تھی کہ ان بدمعاشوں نے شراب کے نشہ میں تم کو جگا دیا۔ چار پانچ نوجوان آدمی اس کوٹھری کے پڑوس میں ٹھکے ہیں شکل صورت سے تو بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں مگر انتہا کے پاجی اور دل خدا ان سے بچائے۔ تب شرابیں لنڈھائی ہیں

اب تھوڑی دیر میں جوتی پیزار ہی چاہتی ہے۔ وہ جوتی اُچھلے کہ توبہ ہی بھلی۔ خیر اس سے ہمیں کیا۔ وہ چاہیں جوتی پیزار کریں چاہیں غل مچائیں مگر آپ رات بھر سونے نہ پائیں گے۔ واللہ اس وقت قرولی ہوتی تو مزہ چکھا دیتا۔ بی بھٹیاری تم ہی ذرا ان کو للکار دو اور کہو کہ ایک شریف مرض تپ میں مبتلا یہاں پڑا ہوا ہے۔ واسطے خدا کے ذرا خاموش رہو۔"

بھٹیاری نے کہا "میاں خدا گواہ ہے کہ اس کا مجھے خود ہی افسوس ہے۔ ابھی بیچارے کی ذرا یوں ہی سی آنکھ لگی تھی کہ ان موئے شہدوں نے دُند مچائی۔ اُنپر غلّی کی سنو اور دل میں سوچتی ہوں کہ میں ٹھیری عورت ذات اور وہ مردوے اور پھر اپنے آپے میں نہیں۔ جو مجھ ہی پر تیار پڑیں تو میں کیا کروں۔ کہو تو بھٹیارے کو بھیج دوں۔"

میاں آزاد نے کہا "اچھا تم نہ جاؤ۔ اپنے مرد کو بھیجو۔"

بھٹیارے نے جا کر کہا "بہت چلاؤ نہیں۔ یہاں ایک آدمی سوئے ہیں ماندے ہیں۔ آپ کے چلانے چیخنے سے ان کو نیند نہیں آتی ہے؟"

یہ اتنا کہنا تھا کہ سب کے سب بھڑ پڑے۔ ایک نے کہا "دت مردود بھاگ جا یہاں سے۔ دوسرے نے بھٹیارے کی پگڑی اُچھال دی۔ تیسرے نے ٹیپ جمائی۔ چٹاخ کی آواز جو آئی تو میاں آزاد ہنس پڑے اور خوجی نے کہا "نہ ہوئی قرولی ورنہ جہاں کے ہیں وہیں پہونچا دیتا۔"

اس پر بھٹیاری طیش میں آ کر اٹھی اور غل مچا کر انگلیاں مٹکا کر اتنی صلواتیں سنائیں کہ اُن شرابیوں کا نشہ ہرن ہو گیا اور اتنے ڈرے کہ کوٹھری بند کر لی۔ جب غل نہ ہوا تو میاں آزاد پھر سونے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں پھر شور و غل کی آواز آئی اور آزاد کی نیند اُچاٹ ہو گئی۔ میاں خوجی بھی بلبلا کے

میں تھے جاگتے ہی چلّا اُٹھے "ابے او گیدی۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ تم سب کو ایک ہی چوٹ میں خدا گنج پہنچا دیتا"

یہ کہہ کر حضرت لپکے اور اُن کی کوٹھری کے دروازے کو اس زور سے دھم دھمایا کہ چول نکل گئی اور سب شرابی جھلا کر باہر آگئے تو میاں خوجی پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ اُنھوں نے اِدھر اُدھر قرولی اور قرابینچے کی بہت کچھ تلاش کی مگر بے سود۔ خوب پٹے اور جھلا کر دو چار حضرت نے بھی رسید کر دیں تو بہت خوش کہ ہماری چوٹ بھی خالی نہ گئی۔

خیر اس کے بعد وہ سب سو گئے۔ مگر نشہ میں بدمست و خراب۔ صبح کے وقت جبکہ مسافروں نے بقچہ سنبھالا تو ایک دفعہ ہی کوٹھری سے رونے کی سی آواز آئی اور میاں آزاد خوجی چونک پڑے۔ آزاد نے کہا "کیوں یار خیریت تو ہے یہ رونا دھونا کیسا"

خوجی نے کہا "اجی اس فکر میں نہ پڑو۔ یہ شرابی آدمی ایسا ہی کیا کرتے ہیں"

خوجی جو اس کوٹھری کی طرف گئے تو دیکھا کہ ایک شخص مُردہ پڑا ہے اور باقی سب کھڑے رو رہے ہیں۔ ایں الٰہی خیر کرے یہ مرنا جینا کیسا۔ پوچھا "کیوں بھائیو خیریت تو ہے"

ایک نے روتے روتے کہا "میاں کچھ نہ پوچھو سارا نشہ ہرن ہو گیا"

خوجی نے پوچھا "کیوں کیوں خیر باشد۔ آخر ہوا کیا کچھ تو بتاؤ۔ یہ آفت کیا آئی۔

شرابی نے بیان کیا۔ بھائی ہم سب نے مل کر شراب پی تھی۔ اور ہم لوگ روزمرہ شراب پیا کرتے ہیں کل کی بھانڈی بڑی تیز تھی جیسے سم قاتل اور انتہا سے زیادہ لنڈھا گئے۔ یہ شخص بڑا دھاوت پینے والا تھا اور ہم سب کا گرو گھنٹال [illegible] کی اپنی ہی سی

سکے گیا اور خرابی یہ کہ چٹنی نہ کھائی نہ کباب چکھے نہ پانی پیا۔ شراب ہی شراب اُڑا گیا۔ دو بجے ہم سب سوئے مگر وہ پہلے ہی سو رہا۔ سوتے وقت اتنا البتہ کہا کبھی اسوقت گرمی بہت معلوم ہوتی ہے اور کلیجہ کھنچا جاتا ہے۔ صبح کو جب ہم سب اُٹھے تو کچھ اور ہی گل کھلا ہوا تھا۔ آدمی نے حسب معمول حقہ بھرا اور سرہانے رکھدیا۔ خیر کیسے ہو۔ وہ تو تھے ہی نہیں۔ جب چلم جل گئی اور تمباکو جل بھنکر خاک ہو گیا تو آدمی نے دوسری چلم بھری وہ بھی جل گئی تب اُس نے جگایا کہ میاں حقہ بھرا رکھا ہے اُٹھیے اُٹھیے جواب ندارد۔ صدا شد بر گنبدِ الست۔ آدمی نے شانہ پکڑ کر ہلایا چادر اُٹھایا تو اسے مُردے کی سی صورت ہو گئی ہے۔ معاذ اللہ۔ ہم سے کہا تو بد حواس ہو کر ہم نے دیکھا اور ہاتھ مل کر رہ گئے معلوم ہوتا ہے کہ کانٹا لگ گیا۔ کیوں خیر جانے جو ہوا ہو۔ اب مرے تو مرے۔ ہاں یہ داغ حسرت دے گیا۔ خود مرا اور ہم کو قتل کر گیا۔ اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے"

خوجی نے کہا "غضب ہو گیا۔ مفت میں بیچارے کی جان گئی۔ اس شراب خانہ خراب کو خدا غارت کرے۔ مگر اُستاد اب تم سب دھر لیے جاؤ گے۔ اور سزا پاؤ گے۔ لیکن ہم جو تدبیر بتائیں وہ کرو۔ شاید بچ جاؤ"

شرابی نے کہا "ہم کہیں گے کہ سانپ نے کاٹا تھا"

بس "کہیں ایسی حماقت بھی نہ کرنا"

"اچھا بھاگ جائیں گے"

"تو تو دھر ہی لیے جاؤ۔ لوگ تاڑ جائیں گے کہ کچھ دال میں کالا ہے"

"اچھا ہم کہیں گے کہ چھُری مار کر مر گیا اور گلے میں چھُرا ابھی بھونک دیں گے"

"بھئی اب تم لوگ ایک کام کرو خوب روؤ اور سر پیٹو۔ ایک تو اُس کو اپنا حقیقی بھائی بتاؤ۔ دوسرا بہنوئی بتاؤ۔ تیسرا ماموں۔ چوتھا سالا اور جو کوئی

پوچھے کہ کیا ہوا تھا تو کہنا کہ درد گردہ کے عارضے میں مرے اور یہ بھی کہنا کہ اس مرض میں وہ لڑکپن سے مبتلا تھے۔ شام کو میٹھا میٹھا درد بتاتے تھے صبح ہوتے ہوتے مر ہی گئے بیچارے۔ افسوس خوب چلا چلا کر چلّا کر رُوتا اور آنسو ٹپ ٹپ گرتے جائیں جو اشک یوں نہ آئیں تو مرچیں لگا لو۔ خاک آنکھوں میں جھونک دو سمجھے۔ ایسا نہ ہو کہ گڑبڑا جاؤ تو پھر جیلخانہ نصیب ہو"

"آپ گواہی دیجئے گا کہ درد گردہ تھا"

"ہاں ہاں جی کہتے جائیے۔ پھر اور کیو تکر کہیں"

کسی ذات شریف نے جا کر پولیس میں جڑ دی کہ سرا میں لٹیروں لوگوں نے ملکر ایک مہاجن کو زہر دے دیا۔ اور اس کا روپیہ لیکر چلتا دھندا کیا۔ تھانیدار اور دو تین برق انداز وردیاں پہنے رپ رپ کرتے ہوئے سرا میں آن پہونچے تمام حال دریافت کرنے کے بعد میاں خوجی سے پوچھا کہ آپ اس بارے میں کیا جانتے ہیں۔

خوجی نے شروع کیا "عرض کروں غریب پرور۔ پرسوں شب کو بندہ از بس اچھا اس سے کیا واسطہ۔ خلاصہ یہ کہ ہم سب چلو یہ بھی نہ سہی"

تھانیدار ہنسا اور بولا معقول "اے صاحب فرمائیے"

خوجی نے بیان جاری رکھا۔ آپ تو بڑے جلد باز آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ قبلہ۔ کہتا ہوں کہتے کہتے کہوں یا ایک دفعہ ہی اُگل پڑوں۔ سنئے جناب کہ کل شب کو میاں آزاد کی طبع مبارک نصیب اعدا بے لطف تھی مسکنات اور مبردات کے استعمال سے ذرا آنکھ جھپکی تو سنا کہ پڑوس کی کوٹھری میں ایک شخص چلا رہا ہے۔ قیاس سمجھا کہ کریب ضرور ہے۔ ورنہ اس قدر بے چینی نہ ہوتی آدمی ہوں خدا ترس اور فقیر القاب دوڑا گیا جاکے دیکھا تو درد گردے کے

عرض میں اس مرحوم کو مبتلا پایا اور اس کے اعزا کو مغموم و ملول تشفی اور تسکین کی باتیں جہاں تک یاد تھیں سب بیان کیں مگر مطلق فائدہ نہ ہوا۔ آخیر تھوڑی دیر میں بصد حسرت بندہ واپس آیا اور سو رہا صبح کاذب کے وقت رونے کی آواز کان میں آئی۔ اور ان لوگوں کو کمال مضطر پایا۔ تو افسوس ہوا۔ اب ان کو سمجھاتا ہوں کہ دل کو ڈھارس دیں صبر کریں کیونکہ صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

تھانیدار نے روزنامچہ میں لکھ لیا کہ سرائیں بر سر موقع تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ درد گردہ میں مر گیا۔ اس کے عزیز و اقارب اور خاص حقیقی بھائی موجود ہیں۔ میاں خواجہ صاحب اور میاں آزاد دونوں گواہ ہیں اور ان کی گواہی معتبر اور مستند ہے۔

" میاں خوجی ریشہ خطمی ہو گئے کہ بڑا پالا جیتا۔ یہ سب ان ہی کی رائے کا نتیجہ تھا۔

" میاں آزاد کو خوجی نے ٹھنڈائی پلائی تو تھوڑی دیر میں ذرا اُن کی آنکھ کھلی۔ جان میں جان آئی اور اشتہا معلوم ہوئی۔ میاں خوجی نے بھٹیاری سے کھچڑی پکوائی اور میاں آزاد کو کھلوائی مگر تھوڑے ہی عرصہ میں کھچڑی نے بڑی تبخیر کی۔ خوجی نے آلو کا آب زلال دیا۔ بارے خدا خدا کر کے ذرا میاں آزاد کی آنکھ لگی تو خوجی چلے سیر گشت کو۔ چلتے چلتے ایک محلے میں پہونچے اور وہاں گھانس چکانے لگے۔

" اس گٹھے کا کیا لوگی؟ " !

" دو آنے "

" ہشت "

" وبست "

" نہ ہوئی قرولی نہیں تو پیٹ چاک کر ڈالتا "

اس پر گھسیارن نے گٹھا ان پر پھینکا اور یہ بیچارے اس گٹھے کے بوجھ سے دھم سے زمین پر آ رہے اور بالکل دھنس ہی گئے۔ نکلنا مشکل ہو گیا اور لگے غل مچانے۔ "او گیدی تو ہوا قرابتیچہ نہیں تو بتا دیتا قلعی کھل جاتی ساری۔ اچھے سے اچھے ڈاکو میرا لوہا مانتے ہیں۔ ایک ڈاکو نہیں پچاسوں کو ہم نے چت کیا ہے او گھسیارن اور ہم سے لڑے۔ اب اٹھاتی ہے گٹھا یا نہیں۔ آن کر قرولی بھونک دوں"

لوگوں نے گٹھا اٹھایا اور میاں خوجی بہزار خرابی نکلے تو گرد برو داڑھی پر خاک۔ لت پت بالکل۔ گھسیارن تک سے جیت نہ سکے۔

میاں آزاد کی آنکھیں ابھی تک جل رہی ہیں کہ بلا انتہا کا ضعف اسقدر کہ معاذ اللہ میاں خوجی بھی گھبرا گئے۔ سوچے کہ اب بلا مدد طبیب کارروائی محال ہے اور مرض طول کھینچتا جاتا ہے۔ بی بھٹیاری سے پوچھا کہ خدا کے لئے سچ سچ بتاؤ کہ کوئی طبیب بھی یہاں رہتا ہے"

"اس نے کہا "یہاں حکیم نہ طبیب۔ مگر ہاں ایک بڈھے حکیم ہیں۔ وہ مطب تو نہیں کرتے لیکن مروت میں ادھر ادھر علاج کرتے ہیں۔ کہئے تو ان کو بلا لاؤں۔ لیکن اتنا سوچ لیجئے کہ ان کی تعظیم تکریم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھئے گا وہ بڑے چکھلے اور تیکھے آدمی ہیں"

خوجی نے کہا "ہم اسقدر خوشامد کریں گے کہ وہ بھی خوش ہو جائیں"

بی بھٹیاری نے جا کر حکیم صاحب سے عرض کیا۔ حکیم صاحب نے استخارہ دیکھ کر فنس نکلوائی۔ تو آپ فنس میں داخل چلے اور سرا میں پہونچے۔ بسم اللہ کہہ کر کہاروں نے فنس رکھی اور حکیم صاحب جا کر میاں آزاد کے پلنگ کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھے"

"آداب بجالاتا ہوں" آزاد نے کہا۔

"بندگی" حکیم صاحب نے جواب دیا۔

خوجی نے حال بیان کیا" انتہا کا ضعف ہے حکیم صاحب۔ بات کرنے کی تاب نہیں معاذ اللہ کا مقام ہے۔

" آپ کے کون ہیں" حکیم صاحب نے دریافت کیا۔

" جی حضور یہ بندہ زادہ ہے"

آزاد دانت پیس کر رہ گئے۔

قلم دوات کاغذ آیا اور میاں خوجی کو حکیم صاحب نے نسخہ لکھ دیا اور کہا کہ اسی وقت اس کا استعمال کیجئے اور دیکھ رخصت ہوئے میاں خوجی عطار کی دوکان پہ پہونچے۔ اب سنئیے کہ نسخے میں لکھا تھا روغن گل آپ نے پڑھا روغن کِل۔ عطار سے پوچھا " کیوں بھئی مٹی کا تیل کہاں ملے گا"

اس نے کہا" ماڈ واڈی کی دوکان پہ"

وہاں سے آپ کیروسائن آئیل یعنی مٹی کا تیل جو لیمپوں میں جلاتے ہیں اٹھالائے۔ خیر دوا بھگوئی اور پلائی تو مٹی کے تیل کی بو آئی۔

آزاد نے کہا" یہ بدبو کیسی؟ اف دماغ پراگندہ ہو گیا"

تو میاں خوجی نے خوب ہی للکارا" واہ بڑے نازک مزاج ہیں آپ۔ آپ کو سب میں بدبو ہی آتی ہے۔ اب کوئی عطر پلائے آپ کو یا زعفران کا طبیعت چرائے تو آپ خوش ہوں۔ لاحول ولا قوۃ"

میاں آزاد کو جو انھوں نے ڈپٹا تو خاموش ہو رہے کہ بھئی ہم بیمار اور یہ تیماردار ہے، جو کہا وہی کریں گے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد طبیعت بے چین ہوئی اور تپ کی وہ شدت کہ الاماں الحذر۔ میاں خوجی حکیم صاحب کے

پاس دوڑے گئے۔

حکیم صاحب نے ہنس کر پوچھا "کہئے آپ کا صاحبزادہ کیسا ہے"

"جی قبلہ نہایت ہی کرب ہے اور کیوں نہ ہو پھر آپ جانئے مٹی کا تیل کہاں تک کرب نہ کرے۔ وہ نفیس مزاج آدمی ٹھہرا"

"یہ مٹی کا تیل کیسا میں کچھ نہیں سمجھا"

"جی ہاں آپ کا ہے کو سمجھنے لگے۔ آپ تو بجھتے ہیں۔ روغن گل لکھ آئے اور اب آپ الٹا مجھی کو ڈانٹے ہیں۔ خیر صاحب حکیم ہیں آپ"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا غضب کیا انتہا کے احمق ہو کیسے جانگلوؤں سے سابقہ پڑا ہے۔ خیر تو یہ نسخہ اور بلوا دو جاکر"

میاں خوجی نے نسخہ لیا اور عطار کی دوکان پر سے ادویہ لے کر گئے اور آزاد کو دوا پلائی مگر تسکین نہ ہوئی تو شام کو آزاد ڈاکٹر کی تلاش کرنے لگے۔

خوجی کی رائے یہ تھی "ڈاکٹروں کی دوا خار ہوتی ہے تپ کا علاج ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔ تشریح کے البتہ بادشاہ ہیں سو خدا کے فضل سے آپ کو پھوڑا تو ہے نہیں۔ مگر آپ کی بیماری نے میرے کلیجے میں ناسور کر دیا ہے۔"

آزاد نے کہا "یہ جہلا کا قول ہے کہ صرف تشریح ہی تشریح ڈاکٹر جانتے ہیں اور تپ کا علاج نہیں کر سکتے ابھی جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو لاؤ"

خوجی پتہ پوچھتے ہوئے اسپتال چلے مگر بعض لوگوں نے بہکا دیا تو حضرت نے تھانہ کی سڑک دھری۔ آدھ کوس زمین نکل گئے تو لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اسپتال پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ بہکانے والوں کو گالیاں دیتے ہوئے چلے۔ آخر کار خدا خدا کر کے اسپتال پہونچے اور ڈاکٹر کو ساتھ لیکر واپس آئے۔

ڈاکٹر نے میاں آزاد کو دیکھا اور کہا "زبان دکھاؤ۔ زبان"

"بہت دکھ ہوتا ہے لیجئے جبان"

خیر ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھا اور دو روپیہ فیس کے لئے اور چمپت ہوئے میاں آزاد نے چار گھنٹہ ڈاکٹر کی دوا کی مگر تشنگی کا غلبہ ہی ہوتا رہا۔ ہر مُن مو سے العطش العطش کی آواز آنے لگی۔ خوجی بیچارے بھی گھبرا گئے اور صبح ہوتے ہوتے ایک بید راج کو بُلا لائے۔

بید راج نے پوچھا "مہاراج۔ یا داس دُکھت ناہیں ہے۔

"میں تو پھنکا جاتا ہوں تم کہتے ہو چار نہیں آتا"

خوجی بولے "بید جی کوئی جڑی بوٹی لاؤ۔ ہے یا نہیں"

"ہے سب کچھ ہے۔ کیا نہیں۔ پرہیز کھادنے والے اور کدر کرنے والا چاہیئے۔

الغرض بید راج نے ایک گولی دی اور شہد کے ساتھ چٹا دی۔ تھوڑی ہی دیر میں اجابت کی ضرورت ہوئی اور آتے ہی پلنگ پر چار و ناچار چت گر گئے۔ میاں خوجی بہت ہی گھبرائے اور گھبرا کر چلے پھر بید کو بُلانے گئے تو راستے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر ملے۔ یہ انھیں کو گھیر گھار کر لائے۔ انھوں نے دو قطرے دوا کے ایک چھوٹی سی شیشی سے پانی میں ڈال دیئے۔ اس کے پینے کے ایک آدھ گھنٹے کے بعد طبیعت بے چین ہونے لگی تو اب جا کر حکیم صاحب کو بلا لائے انھوں نے وہ نسخہ بدلا اور ایک اس کی جگہ پر لکھا۔ اسی طرح بدلتے چلے گئے۔ میاں آزاد کو آرام ہوا۔

آخر کار میاں آزاد سرا سے روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں ایک پُر فضا مقام پر گھوڑے سے اتر کر املی کے درخت کے سایہ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھانے لگے اور خوجی سو رہے۔ یہاں پُر فضا اور ندرت انتہا مقام دیکھ کر طبیعت ہی خوش ہو گئی۔ آپ کی رنگت ہی بدل گئی گویا کبھی

مارے ہی نہیں رہا ہوئے تھے ۔

(۳)

الغرض میاں آزاد اور میاں خوجی دونوں چلے ۔ اثنائے راہ میں گھوڑوں کو تیز کیا تو دن سے داخل لکھنؤ۔ یہاں دونوں نے خوب سیر گشت کی۔ آخرکار میاں آزاد گھومتے گھامتے اور خوجی افیون کی پینک میں جھومتے جھامتے ایک نواب کے دولت خانے پر پہونچے۔ کوٹھی سجی سجائی معتدد کمرے سب آراستہ پیراستہ سجے ہوئے دُلھن بنے ہوئے۔ خوجی اپنے نواب کے تزک و احتشام کو بھول گئے جا کر بہ ادب دونو رہ کے دونو بیٹھے۔ خوجی تو نواب زادوں کی صحبت اُٹھائے ہوئے تھے ہی دیکھتے ہی کوٹھی کی اس درجہ تعریف کی کہ پل باندھ دیے بولے ۔

"حضور خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ کیا سجی سجائی کوٹھی ہے۔ دلھن ہے دلھن قسم حسین کی آج تک ایسی عمارت، اور اس سج دھج کی تعمیر نظر سے گذری ہو۔ ہم نے تو اچھے اچھے رئیسوں کی مصاحبت کی ہے مگر واللہ جو کبھی یہ ٹھاٹھ نہیں دیکھے ہوں خدا چشم زخم سے بچائے واللہ بادشاہوں کے رہتے ہیں۔ اتنے رفیق اتنے مصاحب یہ شان یہ ریاست، ہے کسی میں اے توبہ۔ یہ بات کہاں پائے اور پھر اس عمارت پر خلق کس درجہ ہے کہ اخلاق محمدی کا پورا پورا ہے۔ خدا ایسے رئیس کو سلامت و باکرامت رکھے حق تعالے ہمیشہ بامراد رکھے ان کی بدولت ہزاروں غریبوں شریفوں کا بھلا ہوتا ہے۔ ان کی ذات تو منبع محاسن و کمالات ہے بہت [illegible] ایسے عالی ہمت امیر دیکھنے میں آئے

اس وقت جی خوش ہو گیا"

اس پر نواب صاحب کے مصاحبین نے اور بھی مبالغہ آمیز داد دی میاں آزاد گھبرا گئے اور خوجی کو لیکر چل کھڑے ہوئے۔ لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہونچے اور ہوٹل میں جا کر کھانا مانگا۔ چپراسی نہایت ہی قیمتی بیش بہا پلیٹوں میں طرح طرح کا عمدہ کھانا لایا۔ میاں آزاد نے چھری کانٹے سے خوب مزے سے چکھا اور سوڈا واٹر اور لیمنڈ پیا اور باہر آئے کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی بھی بستر جمائے ہوئے پڑا تھے اور کباب کلیجے چکھ رہے ہیں۔

آزاد نے کہا "واہ یار تم تو خوب مزے سے کباب اُڑا رہے ہو۔

" پھر کوئی شراب اُڑائے کوئی کباب کھائے"۔

" ایں شراب۔ لاحول ولاقوۃ۔ اے میاں شراب کس نے منہ سے لگائی یہ کس کی شامت آئی۔ قسم قرآن کی کس مردک نے شراب کا ایک قطرہ بھی چکھا ہو۔ شراب پی ہو تو سور ہی کا گوشت کھایا ہو۔

خوجی مسکرا کر بولے "تسلیم ایک نہ شد دو شد۔ آپ نے سور کا گوشت بھلا کب چھوڑا ہو گا۔ واللہ مانتا ہوں کہنے لگے کہ شراب پی ہو تو سور کا گوشت کھایا ہو۔ معقول۔ یہ تو آپ جب کہیں جب اس کو حرام یا کروہ بھی سمجھیں۔ اب دونوں کو حلال اور اُن کے استعمال کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ یار آج تم نے غضب ہی کر دیا۔

" ارے بھئی آخر کیا کیا کچھ کہو گے بھی یا ملاحی ہی سُنائے جاؤ گے۔ سبحان اللہ قسم لو جو ہم نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو یا سور کے گوشت کی صورت بھی دیکھی ہو"

" ہاں یہ آپ نے خوب کہی کہ سور کے گوشت کی صورت نہیں دیکھی ہو گی مگر یار مزا تو خوب چکھا ہو گا اور شراب کو آپ ہاتھ کیوں لگانے لگے لگائی ہو گی گلے

اور آپ کی قسم کا کس مردود کو اعتبار ہے قسم کو تو آپ مانتے ہی نہیں تھے آج تک

یہی نہیں معلوم ہوا کہ آپ کا دین و ایمان کیا ہے۔ تمہارا تو بابا آدم ہی نرالا ہے۔
خیر جی اپنی اپنی سب بھگت لیں گے ہم کو اس بکھیڑے سے واسطہ۔

"ہاری مانتے ہد یا جیتی"

"مانیں کیا خاک۔ مانیں کیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ چھُری کانٹا کھٹا کھٹ چل رہا ہے"

"تو بھائی چھُری کانٹے سے کوئی شراب پیتا ہے"

"ہم کیا جانیں۔ ہماری جانے جوتی کہ شراب کیونکہ پیتے ہیں یہ کسی اپنے ایسے میگسار بادہ خوار سے تحقیقات کیجئے۔ افسوس واللہ بس تم گئے گذرے۔ ہائے ستم۔ خیر مضیٰ مامضیٰ۔

"آپ ایک کام کیجئے ہوٹل میں جا کر"

"ارے لاحول۔ ارے لاحول۔ خدا ایسی جگہ کسی سچّے اور پکّے مسلمان کو نہ لیجائے۔ توبہ توبہ (اپنے کان پکڑ کر) خداوند بچائیو۔ گنہگار بندہ ہوں۔ الٰہی توبہ۔ ہوٹل میں اور ہم جائیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ بس آپ ہی کو مبارک رہے قبلہ۔ بندہ درگذرا"

میاں آزاد ٹہلنے لگے اور خوجی نے کباب کلچوں پر خوب ہاتھ لگائے۔ جب صفاچٹ کر چکے تو حلوائی کی دوکان سے برفی لائے اور افیون کے نشے میں ٹونگا رنے لگے۔

دوسرے دن میاں آزاد اور میاں خوجی پھر نواب نامدار والا تبار کے عالی شان ایوان میں جا ڈٹے۔ یاران سر پل گپ کے یا تو گوخوش بیانی کے میدان میں سرپٹ دوڑ رہے تھے اور اٹھ پراڑ لگا رہے تھے خوجی بھی ان میں شامل ہو گئے۔ نواب صاحب کی یوں تعریف کی "قسم حسین کی۔ کیا خیالات ہیں

حضور کے۔ واہ وہ بات پیدا کی ہے کہ تو بہ ہی بھلی"

مصاحبین نے قہقہہ لگایا اور ایک بولے" واہ حضرت واہ کیا تعریف کی ہے۔ کہنے لگے تو یہ ہی ہے واہ ری تری تو یہ ہی بھلی یہ تو یہ ہی نکلی کی ایک ہی کہی حضرت کس جنگل میں حضور تولد ہوئے تھے۔ آپ نے تو وہ بات کہی کہ تو یہ ہی بھلی۔ یار خدا کے لیے ذری سمجھ بوجھ کر بولا کرو"

دوسرے بولے" اے حضرت بولیں کیا بس اب بولنے کے دن گئے بہارت ہو چکی ہے۔

خوجی دوزانو ہو کر بیٹھے اور بولے" میاں ایک ایک آؤ۔ یا کہو چوکھی لڑیں ہم اس میں بھی بند نہیں۔ میاں سنو۔ یہاں عمر بھر رئیسوں امیروں نوابوں ہی کی صحبت میں رہے ہے۔ تم لوگ ابھی کچھ دنوں سیکھو۔ ابھی بچے ہو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ابھی خدا جھوٹ نہ بلائے تو دودھ کے دانت بھی نہ ٹوٹے ہوں گے۔ آپ اور ہم پہ منھ آئیں شان خدا"

مصاحب نے آگے بڑھ کر کہا" آئیے بس آئیے۔ دو دو نہیں چار چار چوٹیں سہی۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ بندے کی زبان بھی وہ زبان ہے کہ کترنی کو مات کرے۔ زبان آگے جاتی ہے لفظ پیچھے رہے جاتے ہیں"

" زبان کیا چرخا ہے رانڈ کا۔ واہ ری زبان فرمائشی زبان ہے۔ مگر خدا جھوٹ نہ بلائے تو۔ رے اور زے اور ڑے اور ٹے زبان سے نکلتا ہوگا۔ روٹی کو تو حضور لوتی کہتے ہوں گے"

"جب خدا جھوٹ نہ بلوائیے نا۔ آپ اور جھوٹ نہ بولیں واہ وضع کے خلاف ہے ماشاءاللہ آپ کو وضع کا کس درجہ خیال ہے جب سے ہوش سنبھالا کبھی سچ بولے ہی نہیں عمر بھر میں ایک دفعہ دھوکے سے سچ زبان سے نکل گیا تھا

ہیں وہ آج تک افسوس ہے۔

"اور واقعہ میں بتاؤں تب آپ ایک دفعہ سچ بولے تھے ایک شخص نے ان کے باپ کا نام پوچھا انھوں نے بلا جھجک (؟) میں صاف صاف بتا دیا۔ اس کا آج تک رنج ہے۔"

اس پر سب کے سب ہنس پڑے اور خوجی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے اور بولے کیوں حضرت کچھ فرمائیے تو۔ آپ تو خاموش ہی ہو رہے۔"

مصاحب بولے "اجی تم کو کھوں ہے کیا بحث کریں"

خوجی نے کہا "گالیاں دیجئے۔ گالیاں۔ یا نی پی پی کو سے پیچھے پھاڑ کر لڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ۔

اتنے میں میاں آزاد اور خوجی وہاں سے رخصت ہوئے۔ دونوں سرا میں آ کر آپس میں یوں باتیں کرتے رہے۔

آزاد بولے "لاحول ولا قوۃ۔ ایسی صحبت پر تین حرف۔ کیا بھونڈی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ نواب بھی بالکل چونگا ہی ہے۔"

"اور نہیں تو کیا نرے چوغے۔"

"خدا کرے یہ رئیس تناور پڑھ لکھ کر مہذب اور متین فہمیدہ اور سنجیدہ ہو جائیں"

"ارے خدا نہ کرے بھائی۔ یہ تو جاہل ہی رہیں تو اچھا واللہ جو کہیں پڑھ لکھ جائیں تو پھر اتنے کھلے مالشیوں کی پرورش کون کرے"

"جی بجا ہے جھوٹ بولنے والے خوشامد کرنے بے ایمان دغا باز جعلساز تو مزے اڑائیں اور علما و فضلا و کملا جوتیاں چٹخائیں۔"

پھر دونوں سو گئے مگر پچھلے پہر سے کھٹملوں نے میاں خوجی کی ناک میں دم

کر دیا۔ بدن بھر کا خون جونک کی طرح پی گیا۔ ایک دفعہ پینک میں آئے تو مچھر
حضرات نے پنڈلیوں کو بھڑ کی طرح بھنبھوڑ کھایا اور انھوں نے پینک سے
چونکتے ہی غل مچایا کہ "لانا میرا قرابینچہ" یہ ہانک جو انھوں نے لگائی تو آس پاس
والوں کی نیند حرام ہو گئی۔ سمجھا چور کا گمان ہوا۔ لینا لینا جانے نہ دینا۔ چور چور
میاں خوجی نے جو لینا لینا جانے نہ پائے چور چور کی آواز سنی تو خود بھی
غل مچانا شروع کیا" ہائیں! ہائیں! خبردار جانے نہ پائے۔ لانا میری قرولی۔
او چور۔ او گیدی ٹھہرا رہنا کہ میں بھی قرولی لے کر آن پہونچا" میاں خوجی جو
گرمائے تو چھپر کھٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لپک پڑے۔ آپ آؤ دیکھتے نہ
تاؤ۔ گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں" لینا لینا لینا۔ لپکے تو بھٹیاری کو ڈپٹ دیا
اور فرمایا" تو ہی چور ہے" اتنے میں آپ نے دوڑنا شروع کیا۔ پینک میں
سوجھ گئی کہ چور آگے بھاگا جاتا ہے۔ دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھاتے ہیں تو
اڑاڑا دھوں۔ میاں خوجی اپنی شامت اعمال سے گرے بھی تو کہاں جہاں
کمہار کے ہنڈے رکھے تھے گرنا تھا کہ کئی ہنڈے چکنا چور ہو گئے۔ کمہار نے
للکارا کہ چور چور۔ یہ اٹھنے کو تھے کہ اس نے آن دبوچ لیا اور پکارنا شروع کیا
کہ "ارے دوڑو۔ چور پکڑ لیوں" سب کے سب دوڑ پڑے اور میاں خوجی پر خوب
بے بھاؤ کی پڑنے لگی۔ یار لوگوں نے تاک تاک کے تڑاتے کے ہاتھ لگائے۔
اب خوجی کی سٹی بٹی بھول۔ نہ قرابینچہ یاد رہا نہ قرولی۔ جب خوب پٹ پٹا
چکے تو ایک مسافر نے کہا کہ بھئی ذرا ٹھہرو تو یہ خوجی ہیں جو اس کوٹھری میں
پانچ سات روز سے ٹکے ہوئے ہیں۔ چراغ جلا گیا تو معلوم ہوا کہ تیرہ صدی کے
یا نشتئے میاں خوجی ہی ہیں۔ کمہار کو لوگوں نے للکارا کہ چھوڑ دے بے یہ چور نہیں
ہنڈوں کے دام ہم دے دیں گے

الغرض بعد خرابی بسیار میاں خوجی کی جان بچائی مگر کب جب کچومر نکل گیا۔
میاں آزاد سے بھی کسی نے کہہ دیا تھا کہ تمہارے ساتھی خوجی چوری کی علت میں
پکڑے ہیں کسی مسافر کی ٹوپی چرائی تھی سو اُس نے پکڑ لیا۔ میاں آزاد کو بڑا ہی
بُرا معلوم ہوا کہ ہمارا ساتھی اور چوری کی علت میں ماخوذ ہو مگر یہ بات ان کو
جچی نہیں۔ سوچے کہ خوجی ایسے آدمی نہیں۔ وہ چوری چکاری کیا جانیں۔ انھوں
نے دل میں ٹھان لی کہ چلیں اور خوجی کو بچائیں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ خوجی
صاحب جھومتے ہوئے چلے آتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں "ہارے تیرے گیدی
کی طرح آزاد بنا ہے۔ ایسے آزاد بہت دیکھے ہیں۔ مردود چارپائی پر پڑا خرخر
کیا کیا اور ہماری خبر ہی نہیں" اب بڑبڑاتے ہوتے ہوئے میاں آزاد کے
پاس تک چلے آئے مگر آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ اتنا بھی نہ سوجھا کہ آزاد
کھڑے ہیں۔ جب قریب پہونچے تو میاں آزاد نے یوں کہا "خیر ہم کو تو پیچھے گالیاں
دینا اب یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے"
"ہاتھ پاؤں! ہو ںتھ۔ یہ لوہے کی سلاخیں ہیں۔ اس وقت ہوتے تو
دیکھتے کہ بندۂ درگاہ نے کیا کیا جوہر دکھائے پچاس آدمی گھیرے ہوئے تھے۔
پورے پچاس۔ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ واللہ میں اسوقت پھلجھڑی بنا تھا بس
یہ کیفیت تھی کہ دس آدمی اس شانے کو اور دس ہی اس شانے کو پکڑے
ہوئے تھے اور میں جو پھرا تو کسی کو اَنٹی دی۔ دھم سے زمین پر گرا کسی کو کولے پر لاد کر
مار اکھٹ سے چھپر کھٹ کی پٹی پر دو چار میرے رعب میں آکر تھرتھرا کر گر ہی تو پڑے
دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی۔ یہ ڈھیکلی کھائی وہ ہو رہا۔ ادھر نکلا اُدھر
اُبھرا گھس بیٹھ میں تو پھر آپ جانئے اپنجانب برق دم ہیں ہی جو سامنے آیا اُسے
نیچا دکھایا۔ جو منھ چڑھا منھ کی کھائی۔ خدائی بھر میں کوئی ایسا جیوٹ دار آدمی

دکھا تو دیجئے"۔

خیر میاں آزاد اور خوجی دونوں اسوقت سو رہے اور دوسرے روز شام کو نواب صاحب کے ہاں پہونچے۔ آزاد تو نواب صاحب سے رخصت ہو رہے میاں خوجی ڈیوڑھی پر پہونچے اور تپائی پر بیٹھ کر پینک میں جھومنے لگے۔ اتنے میں نواب صاحب کے یہاں کی نوکرنی بوا زعفران محل خانہ سے باہر آئیں۔

اب یہ لطیفہ بھی سُننے کے قابل ہے کہ بوا زعفران کے میاں کی بھی بعینہ یہی قطع مبارک تھی۔ خوجی سے بالکل مشابہ ذرا فرق نہیں۔ وہی سوا بالشت کا قد۔ وہی دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں اور طُرّہ یہ کہ افیم بھی پیتے تھے۔ اور زعفران ان سے روز کہا کرتی تھی کہ تم افیم کھانا چھوڑ دو۔ وہ کب چھوڑنے والے تھے بھلا۔ اسی سبب سے دونوں میں دم بھر نہیں بنتی تھی۔ آخر کار لیک وزا سکے میاں نے کہا کہ اچھا آج سے اگر ہم کو پینک میں دیکھو تو گِنکر پانچ سو جوتے لگاؤ اور جو بھول جاؤ تو بھر سرے سے گنو۔ زعفران نے جو باہر آکر دیکھا تو حضرت موجیں لے رہے ہیں۔ جل بھن کر خاک ہی ہو گئی اور جاتے ہی میاں خوجی کے پٹے پکڑ کر ایک دو تین چار پانچ دھپیں تڑ تڑ لگا ہی تو دیں۔ خوجی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ مار کے آگے بھوت ناچے۔ چونک کر بولتے کیا ہیں "لانا تو ولایتی قرولی ارے ان سرائے والوں نے تو ہماری کھوپڑی پلپلی کر دی"۔

اب ادھر نواب صاحب اور اُن کے مصاحبین قہقہہ لگاتے ہیں ادھر گھر میں قہقہ کی صدائیں بلند ہیں اور خوجی اپنے دل میں خفیف کہ یکے نقصان مایہ دیگر شماتت ہمسایہ۔ نواب صاحب نے فرمایا "زعفران کی سزا ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ خوجی کو دیدی جائیں"۔

خوجی بولے "بس غلام کے حال پر رحم کیجئے۔ معاف فرمائیے مجھے۔ بندہ درگذرا۔ غضب خدا کا اس دیو کی بچی کے ساتھ اور میں شادی کروں۔ خدا بچائے

خدا ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ میاں کے دھوکے دھوکے ہیں تو اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیئے۔ اور جو کہیں سچ مچ میاں ہی ہوتے تو معاذ اللہ جیتی ہی کر ڈالتی۔ کیا کہیے کچھ بس نہیں چلتا ورنہ نوابی ہوتی تو اتنی قرولیاں بھونکی ہوتیں کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتی۔ یہاں کوئی ایسے ویسے نہیں۔ گھانس نہیں کھودی ہیں چکلہ داریاں۔ کمیدانیاں۔ رسالداریاں کیا کئے ہیں"۔

میاں آزاد نے کہا "میاں ڈوب مرو جا کر چلّو بھر پانی کافی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ ایک عورت سے ہاتھا پائی میں جیت نہ پائے۔

خوجی نے جواب دیا "جی وہ عورت سو مرد کے برابر ہے۔ جھپٹ پڑے تو آپ کے حواس بھی فرو ہو جائیں۔

غرض میاں آزاد اور خوجی سراپہو نچکر چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ گوشت اور روٹی اور باقرخانی اور کباب کی فکریں ہونے لگیں اور لدپھند کر اسٹیشن پر چلے۔

خوجی بولے "یا خدا بچائیو"

آزاد نے کہا "این! خیر باشد کیا شیطان نے انگلی دکھائی یا بوا زعفران یاد آئی۔

"اجی حضرت یہ تو فرمائیے کہ آپ چلتے کہاں ہیں۔ اُف میدان جنگ میں گولیوں اور چھروں کے منھ میں خدا ہی خیر کرے۔ یار ایک چنے کے برابر گولی میں تو کام تمام ہو جائے گا۔ بھائی کہا مانو۔ حسن آرا سے در گزر دینا

"بہت خوب سے لے بس اب زیادہ بک بک نہ کیجئے"

"حضرت چلنے کو تو ہم چلتے ہیں مگر اتنی شرطیں قبول کیجئے تو بسم اللہ ورنہ بندہ رخصت ہو۔ انشاء اللہ نگوڑا شاہ ... کہنے کو تیار ... ایک شرط ماننی

ہوگی ورنہ آپ اپنی راہ لیں۔ میں اپنا راستہ لوں۔"

شرط اوّل قرولی ہم کو ضرور لے دیجیئے اور ایک قرابچہ بھی ہمارے پاس رہے۔ چلتے ہیں تو مورچہ پر آپ اور ایک پھول کی چھڑی تک پاس نہیں۔

دوم برس بھر کے صرف کیلئے افیم اینجانب کو دیجئے میں اپنے لادے لادے پھروں گا۔ ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی اور بے موت انٹا غفیل ہو جاؤں گا۔ آپ تو عورتوں کی طرح نشے کے عادی ہی نہیں مگر بندہ درگاہ بے افیم پیئے ایک قدم نہ چلیں گے۔ وہاں پردیس میں افیم ملے یا نہ ملے کہاں ڈھونڈھتے پھریں گے۔

سوم۔ اتنا بتا دیجئے کہ وہاں بوا زعفران کی سی ڈنڈ پیل پنجہ کش دیونیاں تو نظر نہ آئیں گی۔ ہوں تو بندہ ابھی سے رخصت ہوتا ہے خدا حافظ۔ اُف فوہ واللہ کیا کس کس کے لاتیں لگائی ہیں اور کیا تان تان کے مکّے بازی کی ہے کہ بیٹھتے ہی نکال ڈالا روح پر صدمہ ہے واللہ روح پر۔

چہارم۔ سرا میں اب ہم تمام عمر نہ اتریں گے اور جو جہاز پر کمہار ہوئے تو ہم بس ڈوب ہی مریں گے۔ اجی اتفاق سے ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھرکم۔ کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ ہنڈا ٹوٹ گیا تو کمہار انجر پنجر ہی الگ کر دے گا۔ لہذا کمہاروں کی صحبت آج سے الفقط۔

پنجم۔ جہاں آپ چلتے ہیں وہاں کانجی ہوس تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان پکڑ کے کانجی ہوس پہونچائے۔ ذرا دریافت یہ کر لیجئے گا۔

ششم۔ ٹٹو پہ ہم سوار نہ ہونگے اس میں چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ہم بیٹھے بٹھائے روز پٹکیں۔

ہشتم۔ ہم کو میاں خوجی نہ کہنا۔ جناب خواجہ صاحب قبلہ کہا کیجئے۔ یہ خوجی کیا معنے۔

نہم۔ ہم یہ بھی ہم نہ جانتے گئے بس باورچی خانہ کا انتظام ہمارے متعلق رہے اور

لوٹ مار میں جو کچھ ہاتھ آئے وہ بھی ہماری تحویل میں رکھا جائے۔

دہم۔ حسن آرا کے نام ایک خط روز لکھنا اور ہر خط میں ہماری طرف سے بندگی بلکہ دعائے خیر۔

یازدہم۔ گولی کھانے کے تین گھنٹہ قبل اور مرنے کے دو گھڑی پیشتر ہمیں اطلاع کر دینا۔

دوازدہم۔ جو ہم خدانخواستہ داخل خلد بریں ہوں تو لاش کو ہندوستان میں پہونچوا دینا اور جہاں والد بزرگوار کی لاش دفن ہے وہاں ہی دفنانا لیکن ہم کو خود ہی نہیں معلوم کہ پدر بزرگوار مرے کب اور دفنائے کہاں گئے اور تھے کون۔ آپ ذرا پتہ لگا لیجئے گا اور تربت پہلو بہ پہلو بنوائیے گا اگر ان کی تربت نہ ملے تو کسی قبرستان میں جا کر جو سب سے بہتر قبر بنی ہو بس اسی کے قریب ہم کو بھی دفنانا اور لکھ دینا کہ یہ ان کے والد ماجد کا مزار شریف ہے۔

سیزدہم۔ پینک کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا۔ اسوقت یہاں استغراق کی کیفیت ہوتی ہے۔

اتنی شرطیں اگر بسر و چشم قبول ہوں تو چشم ما روشن دل ما شاد خانۂ احسان آباد ورنہ خوجی میاں نہ آزاد۔

آزاد نے حسب ذیل جواب دیا۔

۱۔ دسویں شرط بسر و چشم منظور۔

۲۔ گیارھویں شرط بڑی کڑی ہے۔ مرنے سے دو گھڑی پیشتر کیونکر کہیں گے کہ اب چل چلاؤ لگ رہا ہے مگر گولی کھانے کے تین گھنٹے کے قبل بتا دینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

۳۔ اور بھائی شرط خواجہ صاحب تو ہم سے نہ کہا جائیگا ہم تو خوجی ہی خوجی کہیں گے۔

۴۔ بارہویں شرط کیسی لطیف ہے کہ تو اب ان کا لغزاں ... نگی کا بنجی ہو بس۔

آپ خوب مزے سے جہاں چاہئیے گھانس چریئے کوئی چوں تک تو کرے گا نہیں اور کمہار کا تو بہانہ پر کس نہ چڑنے پائے گا۔

۵۔ ایک قرولی ایک قرابین ایک پتھر کلا ایک دھرتی دھمک توپ آپ کو خرید دیں گے آپ مزے سے توپ کو کاندھے پر لادے یا ہاتھ میں لئے جہاں چاہئیے جائیے۔

۶۔ افیم بمبئی ہے، آپ کی پیٹھ پر لاد دیں گے۔ گھبرائیے نہیں۔ کہئیے اب چلئے گا یا اب بھی مچلئے گا۔

خوجی بولے۔ "بسم اللہ کر کیجئے"

الغرض میاں آزاد اور خوجی صاحب نے اسباب کیا اور اسٹیشن پر داخل ہوئے۔ میاں خوجی کو روپے دیئے کہ ٹکٹ لاؤ حضرت جا ڈٹے اور جب وقت گھنٹی ہوئی ٹھن ٹھن اور کانسٹبل نے کہا کہ کانپور کے مسافر چلو ٹکٹ بٹ رہا ہے خوجی بھی لپکے ادھر وہ ریلا آیا کہ خدا کی پناہ۔ ایک ایک پر دس دس گرے پڑتے ہیں۔ بھیڑ میں حضرت خوجی جو پھنسے تو کچلنے لگے۔ غل مچایا کہ "لانا قرولی دو ایک کو تو یہاں ہی شہید کر دوں" اتنا سننا تھا کہ بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی اور میاں خوجی ڈرانے ہوئے ٹکٹ کی کھڑکی کے پاس پہونچے اور بولے" بابو صاحب ٹکٹ دیجئے"

بابو بولا "گول مت کرو"

اجی غل تو سنتے ہو۔ مگر اس غول بیابانی پر نظر ہے۔

"چپ"

"یہ چپ کیسی۔ ٹکٹ دیتے ہو یا میں اسٹیشن ماسٹر سے رپٹ بولوں پھر"

"یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ پھر ریلا آیا۔ وہ ریل پیل کہ خوجی کے ملیتھر ہی بگڑ گئے رپٹ وپٹ سب بھولے اور کوئی بیس قدم پیچھے ہو گئے۔ خیر بعد خرابی بصرہ خدا خدا کر کے ٹکٹ لئے اور جا کر ریل پر بیٹھے۔ ریل چلی تو میاں خوجی کو آزاد نے جگایا کہ

"اُٹھئے جناب خواجہ صاحب کانپور آگیا"

"واللہ بھئی واہ ری ریل۔ ایک ہی مرتبہ کی پینک میں کانپور پہونچ گئے"

(۴)

کانپور میں ریل سے اُترے تو میاں آزاد کو ان کے ایک دوست مل گئے۔ یہ دوست ان کو ایک مشہور رئیس کے گھر لے گئے۔ ان رئیس کے یہاں ٹھہر کر میاں آزاد اور خوجی پھر بگھی پر اسٹیشن کو واپس آئے۔ خوجی نے ان رئیس کے بابت کہا "تو بہ ہی بھلی۔ اچھّے رئیس کے یہاں گئے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ وہ کہئے آپ سا بے تکلف ولگی یا زنہ ہو تو وہ رئیس واللہ گردن میں ہاتھ دلواتا۔

خیر ریل پر سوار ہوئے اور چلے تو میاں آزاد اور خوجی کے کمرے میں ایک گنوار اور ایک وضعدار بھی بیٹھے تھے۔ گنوار کو دیکھ کر میاں خوجی نے کہا۔ "طوطی را بزاغے در قفس کردہ"

اتنے میں گنوار نے پاؤں بڑھایا اور بنچ پر دراز ہوئے پھر دوسرا پاؤں بڑھایا تو کھٹ سے میاں خوجی کے سر پر پڑا۔ خوجی پینک میں آگئے تھے چونک کر بولے "او گیدی بد تمیز نکالوں قرولی پھر" اور آزاد کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "ارے قرولی لے دینا تو آپ بھول گئے"

گنوار نے بگڑ کر کہا "ہم چمار ناہیں ہیں مجور۔ ہم سے گالی گپتا نہ بکو۔ جیسے تم ہو کرایہ دیئے ہم ہو دیا۔ پھر تم ہمکا ڈپٹت کاہے کا ہو"

خوجی بولے "بہت کون دوں کے بھروسے نہ رہنا۔ میں کانوں میں سرکہ دونگا۔ اب کی ریل سے اُترتے ہی قرولی لے لیتا ہوں"

وضعدار حضرت نے گنوار کو ڈانٹا "ابے چپ نہیں رہتا۔ بے کار ٹین ٹین لگائی ہے"

وہ چپ رہا۔ میاں آزاد کو وضعدار صاحب نے پان دیا تو خوجی بولے "مگر یہ کہاں کی انسانیت ہے قبلہ وکعبہ کہ ایک کی تواضع کی اور دوسرے کو صفا یا بتایا۔ ایک گلوری ادھر بھی بڑھائیے"

وضعدار صاحب نے کہا "معاف کیجئے گا۔ لیجئے بسم اللہ"

خوجی بولے "آداب تھوڑی دیر میں ایک گلوری اور دیجئے گا"

اس طرح سفر کرتے کرتے ہمارا شتر ہوپہنچے اور وہاں کچھ دیر ٹھہرے۔ یوں تو اس مقام دلپذیر کی ہر ایک شئے بے نظیر پائی لیکن یہ وضع اُن کو سب سے زیادہ بھائی کہ پردے سے مستورات کو اصلاً کام نہیں۔ خوجی کو یہ بات نہیں اچھی لگی اور وہ بولے۔

"کیوں میاں یہاں تو کچھ عجیب رسم ہے بھئی۔ یہ بڑی بڑی شریف زادیاں منھ کھولے پھرتی ہیں۔ اس مطلق العنانی کے صدقے واللہ کیا آزادی ہے۔ لاحول ولا قوۃ شرم وحیا سب بھون کھائی"

آزاد نے کہا "اور سنئیے آپ لاحول پڑھتے ہیں۔ کیوں صاحب یہ لاحول پڑھنا کیا معنے پردہ کیسا۔ پردہ ڈھکوسلے کا نام ہے"

"تو آپ بالکل آزاد آدمی ہیں یوں تو ہر ملکے دہر رسمے مشہور ہے مگر ہمارے ملک میں تو کہاریاں اور مالنیں تک پردہ کرتی ہیں نہ کہ شریف زادیاں معاذاللہ ایک قدم تو بے پردہ کے جاتی نہیں کیا مجال"

"ارے میاں نقاب کو شرم اور حجاب کو آزرم سے کیا سروکار ہمارے ملک ہمارے خاص وطن نانوت و نانوتہ میں تو پردے کا نام نہیں جیسے گوبر ٹوگی میں ردم

دشام میں سب جگہ یہ رسم کافور ہے ویسے ہی ہمارے ہاں بھی۔ مگر ہندوستان کا تو بابا آدم ہی نرالا ہے "

" آپ کا ملک کون خراسان ہے۔ آخر اس آپ کے ملک کا نام تو سُنوں"

" کشمیر جنت نظیر" ہم تو جب ٹرکی سے واپس آئیں گے تو۔ بس یہاں ہی بستر جمائیں گے اور حسن آرا کو ساتھ لے کر مطلق العنانی اور آزادی کے ساتھ ہوا کھلائیں گے صبح و شام۔

" یار بات تو خاصی ہے مگر مجھ منحوس کی بیوی اس لائق ہی نہیں کہ ہوا کھلانے لیجاؤں اور اپنے آپ کو مفت میں ہنسواؤں۔ جی جب حبش جاؤں گا تو وہاں ہوا کھلاؤں گا "

الغرض میاں آزاد اور خوجی مہرشٹ کے ملک سے بمبئی آئے۔ جب بمبئی میں داخل ہوئے تو شہر پناہ کے پاس دونوں میں دو دو چونچیں ہو گئیں۔ آزاد بولے " چلو کسی اچھی سرا میں چلکر بسیرا لیں۔

خوجی نے جواب دیا " کہنے والے اور چلنے والے دونوں کی ایسی تیسی، کیوں بچہ یہی وعدہ پورا کرتے ہو۔ وہ قرولی تو خریدتے ہی رہے اور افیم کے لئے کبھی پورے تولہ گنڈے نہ دیے۔ اب یہ وعدہ خلافی کرتے ہو۔ اسی سے تو ہم نے پہلے ہی قول لیا تھا کہ چاہے آسمان کی جگہ زمین اور زمین کے مقام پر آسمان آجائے مگر اینجانب سرا میں قدم نہ رکھیں گے۔ سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ اُس دن کمھار والے نے اتنی بے بھاؤ کی لگائیں کہ بس ہمارا ہی سر جانتا ہے"،

" اجی اب دنیا بھر کی سراؤں میں کمھار ہی کمھار تو ہیں۔ وہ باتیں کرتے ہو کہ گدھوں کو بھی ہنسی آ جائے۔

" اچھا تو اس شرط پر چلتے ہیں کہ رات کو کسی پیڑ پر بسیرا لینا "

آزاد اور میاں خوجی دونوں چلے تو سرا میں کھٹ سے داخل۔ ایک کوٹھری میں جا کر میاں خوجی تو مزے سے چھپر کھٹ پر دراز ہوئے چار دل شانے چت۔ میاں آزاد بھی دوسری کھٹیا پر لیٹے ہو کر خراٹے لینے لگے۔

خوجی کی آنکھ نہ لگی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کشیدہ قامت بلند و بالا شیطان کی خالہ سامنے سے چمکتی دمکتی ہوئی آتی ہے مگر قد کوئی سات فٹ کا نصف اینچ کم نہ جو بھر زیادہ۔ آستینوں کی پھنسی ہوئی کرتی اور وہ چست اور پھرتی کہ الامان چادر سبز پہنے سبزان چمن کو شرماتی ناز سے قدم بڑھاتی ہوئی میاں خوجی کی طرف آنکلی۔ خوجی نے اس کی طرف نظر ڈالی تو اس نے ایک تیکھی چتون سے ان کو دیکھا اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلی چلی تو حضرت نے سیٹی بجائی اور سیٹی کی آواز سنتے ہی وہ ان کی طرف جھک پڑی اور چھما چھم کرتی ہوئی کوٹھری میں دڑاتی چلی آئی۔ اب میاں خوجی کے حواس بیترا ہوئے۔ سوچے کہ اگر آزاد کی آنکھ کھل گئی تو وہ لے ہی ڈالیں گے کہ اللہ اللہ اب آپ کو بڑے بڑے شوق چرائے اور جو کہیں وہ ریجھ گئے تو پھر ہم کو چرمرہی کر ڈالیں گے اور ہم بس لیموں اور نون ہی چاٹ کر رہ جائیں گے۔ اشارہ سے کہا "ذری آہستہ آہستہ بولو۔"

اس نے کہا "منھ سے کہو کچھ سر سے کھیلو۔ منھ سے بولو"

خوجی منھ پر انگلی رکھ کر بولے "چپ چپ"۔

عورت بولی "واہ اچھے ملے۔ کیا چپ شاہ کا روزہ رکھا ہے"

خوجی نے اشارے سے کہا "میاں آزاد سوئے ہوئے ہیں"

"ان کا لحاظ کرتے ہو کیا باپ ہیں تمھارے"،

"خوجی نے ہاتھ جوڑے اور کہا" واسطے خدا کے چپ بھی رہو"

"چلو ہم تم دوسری کوٹھری میں چل کر بیٹھیں"

خوجی اور وہ عورت جس پر میاں صاحب کا دل آیا تھا چلے اور ایک کوٹھری میں یوں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

خوجی نے پوچھا "آپ کا نام؟"

عورت نے کہا "وکیسر"

"سچ کہنا کہ کہیں زعفران کی ہمشیرہ جان تو نہیں ہو"

"اللہ جانتا ہے کتنے وجیہ جوان ہو۔ اور خدا پاک کی قسم کیا ہاتھ پاؤں پائے ہیں۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو"

خوجی اکڑ کر بولے "ابھی کیا جوانی میں دیکھنا ہم کو"

عورت کہے گئی "ڈیل ڈول کتنا پیارا پایا ہے۔ اور نکھ سکھ سے کتنے درست ہیں آپ کہ ماشاء اللہ۔ جی خوش ہو گیا۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو"

خوجی نے دونوں بازوؤں کو پھڑکا کر کہا "اور جو میں ورزش کروں تو شیدی لنڈھور کو لڑاؤں" "ایک بات کہوں برا تو نہ مانو گی"

"جو برا مانوں گی تو ذرا کھوپڑی سہلا دوں گی۔ چلو چھٹی ہوئی"

خوجی ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "جان بخشی کرو تو کہوں"

"کیا بھٹیارے یا بھٹیاری یا کسی اور کی جان لو گے۔ آخر صاحب یہ جان بخشی کیسی۔ اچھا جو تمہیں کہنا ہو کہو۔ مگر داڑھی صفا ہو"

"خون معاف" خوجی نے کہا۔

عورت نے ایک چپت رسید کیا اور کہا "اے بھکوے خون کیسا"

"یہ دھول دھپا شریفوں میں بھلا کہاں جائز ہے"

"شریف تجھ موئے کو کون نگوڑی سمجھتی ہے۔

"اے ہاں مطلب تو ... غضب ہی ہو جاتا ہے اب لے بتاؤ

کچھ مانگیں تو دو گی"

"ہاں کیوں نہیں۔ کیا میٹھے بولتے ہیں آپ چپیتیاں بجھواتے ہیں"

"ہم مانگتے ہیں کہ قول دو"

"بسم اللہ"

"کہنا یہ ہے کہ مگر کہتے ہوئے دل کانپتا ہے"

"اب میں تم کو ٹھیک۔ نہ بتاؤں کہیں"

"شادی کر لو میرے ساتھ"

"تمہارے ساتھ بیاہ کرنے کو جی چاہتا ہے" پھر خوجی کا کان پکڑ کر بولی۔

"ایک شرط سے شادی کروں گی کہ صبح تڑکے سویرے منھ اندھیرے اُٹھ کر مجھے جھک کے سات بار سلام کرنا اور میں سات چپتیں لگاؤں گی"

"اجی بلکہ دس"

عورت نے جھپ سے میاں خوجی کو گود میں اٹھا لیا اور بغل میں دبا کر لے چلی تو خوجی بہت چکرائے۔ لاکھ پاؤں مارے۔ ہزار زور کئے مگر اُس نے جو دبایا اس طرح لے چلی جیسے کوئی چڑیمار جانوروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے لے چلے اب سارا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ خوجی پھڑکتے ہوئے جاتے ہیں اور وہ کشیدہ قامت عورت چھم چھم کرتی ہوئی اور پھرتی کے ساتھ قدم دھرتی ہوئی یہ گئی وہ گئی ایک مقام پر خوجی بھاگ نکلنے کو تھے مگر اس نے پھر چپڑ غٹو کیا اور بولی

"ایں ہوش کی دوا کر مردوے۔ میں اب عمر بھر چھوڑنے کا نام لونگی نہیں۔ ہم بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں چھوڑ دینا کیا جانیں بس ایک کے سر ہو رہے بھاگے کہاں جاتے ہو میاں"

"میاں ابھی سے کیونکر ہو گئے"

"بس اب زیادہ ٹراؤ گے تو میں اسی وقت سے چپت بازی شروع
کروں گی" اور خوجی کو گود سے اُتار کر بُولی" بھلا تم بھاگ تو جاؤ"
خوجی پیچھے ہٹنے لگے تو اُس نے پٹّے پکڑ کر خوب بے بھاؤ کی لگائیں۔ یہ چلّائے
اور غل مچایا " کوئی ہے۔ لانا قرولی" تماشائی بازاری اِدھر اُدھر ٹھٹ کے ٹھٹ لگائے
کھڑے ہنس رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں "یار وذرا میاں آزاد کو سرا سے بُلا لانا۔
پھر گود میں اٹھا کر لے چلی "مشک دریا کو ٹھنڈا پانی" تماشائی اور بازاری
اور حوالی موالی ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے اور خوجی ایسے جھلائے کہ بوٹیاں نوچے
ڈالتے تھے مگر قرولی میاں ہی میں رہی۔
اتنے میں میاں آزاد جو بیدار ہو ئے تو خوجی غائب تھے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا
کہیں پتہ ہی نہیں۔ خوجی خوجی۔ خواجہ صاحب۔ اجی جناب خواجہ صاحب۔ ایں
جواب ہی نہیں دیتے۔ ارے میاں کہاں ہو۔ وہ ہوں تو بولیں ڈھونڈھتے ہوئے
آئے تو خوجی کو عورت کے چنگل میں دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ للکار کر کہا "چھوڑ دے"
اس نے خوجی کو چھوڑ دیا اور سلام کر کے میاں خوجی سے کہا کہ "حضور
میرا انعام ہوا میں بہروپیہ ہوں۔
میاں خوجی اتے مارے وحشت کے دل میں ٹھان لی کہ جو آئے گا خوب غور
سے دیکھوں گا اور للکاروں گا بھلا ایکی چکما چل جائے تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں
یہاں اُڑتی چڑیا پکڑنے والے ہیں۔ ہم بھی اگر یہاں رہتے ہوتے تو اِس مردود
بہروپیہ کو چچا ہی بنا چھوڑتے۔ وہ غیا دیتا کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتا۔
سامنے ایک گھسیارا گھاس کا گٹھا سر پر لادے۔ پسینے میں عرق عرق
آن کھڑا ہوا میاں خوجی کی کوٹھری کے قریب ایک ٹٹو اسرا میں بندھا تھا وہ سمجھا
ان ہی کا یا بوسے ہے تو اس سے یوں گفتگو ہوئی

"بیچو گھانس تو نہیں چاہیئے"

خوجی نے غور کرکے دیکھا اور بولے "چل اپنا کام کر ہمیں گھانس وانس کچھ نہیں چاہیئے۔ گھانس کوئی اور کھاتے ہونگے۔ ہم اپنے غم میں آپ کاہیدہ ہیں۔"

گھسیارے نے سُنا نہیں تو پھر پوچھا "صاحب کچھ گھانس لوگے"

خوجی سمجھے کہ بہروپیا ہے بولے "چل بے چل۔ ہم پہچان گئے۔ ہم سے بہت چکمے بازی نہ کرنا بچہ اب کی کوئی حرکت سرزد ہوئی تو بیٹھن ہی نکال ڈالوں گا۔ اب جاتا ہے یا آنکھیں دکھاتا ہے۔ تیرے بہروپیئے کی دم میں رسّا"

شامت اعمال سے گھسیارا بہرہ تھا۔ وہ سمجھا کہ بُلاتے ہیں۔ ان کی طرف آنے لگا۔ بس تب تو میاں خوجی غصہ ضبط نہ کر سکے اور چلا اُٹھے "او گیدی بس آگے نہ بڑھنا نہیں تو سر تن سے جدا ہوگا"

یہ کہکر حضرت لپکے اور گٹھا پکڑ کر چاہا کہ اسکو چپت لگائیں اس نے جو زور کیا کہ چھڑا کر بھاگ نکلے تو میاں خوجی منہ کے بل دھم سے زمین پر آرہے اور گٹھا جو گرا تو خواجہ صاحب تپ ہی گئے اور گٹھے کے بوجھ سے ایک لڑھکنی کھائی بولے "او گیدی اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ مردک نے ناکوں دم کر دیا"

خیر بہت ہی جھلّائے منہ پھُلائے بیٹھے تھے کہ میاں آزاد نے جس آدمی کو سرا کھیجا تھا وہ رقعہ لیے ہوئے آیا اور لوگوں سے پوچھ کر اُس نے کہا "چلیئے آپ کو آزاد نے بلایا ہے"

خوجی کڑک کر بولے "کس سے کہتے ہو۔ ارے ابکی زامہ بر بنکر آیا تب کا گھسیارا بنا تھا۔ پہلے عورت کا بھیس بدلا چل بھاگ مردود"

نامہ بر نے کہا رقعہ تو پڑھ لیجئے

"میں جلتی بلتی لکڑی سے داغ دونگا۔ نامعقول۔ مجھے کوئی لونڈا مقرر کیا ہے کیا۔ ایسے ایسے بہروپیئے یہاں جیب میں پڑے رہتے ہیں۔"

نامہ بر چلا گیا۔ میاں آزاد واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک قاضی بھی تھے اور آزاد سے کسی مسئلہ پر یوں بات کر رہے تھے۔

"قبلہ میں نے یہ نہیں کہا کہ ان کا خروج علل ظہور قیامت سے ہے بلکہ علائم قیامت سے ہے اور علائم و دلائل میں یوں بعید ہے کما لا یخفی علی الفطن اللبیب ولو فرضنا ذلک کبری تمھارے قول کا ممنوع ہے۔ بس یہ قیاس منتج صحیح نہ ہوگا وہو المقصود۔

آزاد کہہ رہے تھے "بجا ارشاد ہوا قبلہ"

خوجی پلنگ میں بیٹھے ہوئے تھے بولے "جھوٹے پر تین حرف۔ ہم تو خاک بھی نہ سمجھے۔ اتنا سمجھے کہ گفتگو میں بھیک مانگ رہا ہے کوئی۔ اس منطق سے خدا کی پناہ۔ یہ پنسیری پنسیری بھر کے لغت ڈھلکا دیئے سیل سیلوت اور کما لا یخفی علی الفطن اللبیب اور خدا جانے کیا الم غلم"

میاں آزاد نے خوجی کو ڈانٹ دیا۔ نہایت گستاخ آدمی ہو تم"

اس پر خوجی چونکے اور آنکھیں کھول کر قاضی صاحب کو دیکھا اور بولے "اور دیکھئے گا ذری۔ اب مولانا بن کر آئے ہیں۔ بھئی گرگٹ ٹکے سے رنگ بدلتا ہے واللہ گرگٹ کے سے۔ ابھی گھسیارے بنے تھے ابھی مولوی صاحب بنے ہیں۔ اس نے تو ناکوں دم کر دیا ہے۔

الغرض آزاد اور خوجی سرا سے سب سامان اٹھا کر آزاد کے دوست مرزا صاحب کے گھر آ ٹھہرے۔ یہاں سے ایک دن مرزا صاحب اور میاں آزاد خوجی کو سمندر دکھانے لے چلے چلتے چلتے جب ساحل بحر پر پہونچے تو خوجی نے

نظر بھر کر سمندر کو دیکھا۔ دیکھتے ہی دو چار قدم پیچھے ہٹے اور چیخ پڑے پھر دس قدم پیچھے کھسکے اور رونے لگے "اُف خداوندا بچائیو۔ یا خدا بچا۔ یہ ملک الموت ہے یا سمندر۔ لہریں دیکھتے ہی کلیجے کو کسی نے مسوس لیا۔"

میرزا نے کہا "کیا لطف ہے۔ خدا کی قسم جی چاہتا ہے پھاند ہی پڑوں۔"

خوجی نے مرزا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے "کہیں بھولے سے پھاندنے واندنے کا قصد بھی نہ کرنا۔ حیادار کے لیے ایک چلّو کافی ہے۔"

آزاد نے کہا "عجیب مسخرہ ہے بھئی۔ ایک آنکھ سے روتا ہے ایک آنکھ سے ہنستا ہے۔"

خوجی نے کہا "آپ تو کہتے تھے کہ گنگا کے برابر پاٹ ہے۔ معاذاللہ کچھ ٹھکانا ہے اور چھور ہی نہیں۔ چلتے چلتے پاؤں کے پرخچے اُڑ گئے۔ وہاں کہتے تھے کہ بس تھوڑا سا ہی تو فاصلہ ہے ان فقرہ بازوں سے خدا سمجھے اور تس پر اتنی دور سواری پر آئے ورنہ کیا جانے کیا ہوتا۔"

اتنے میں دو ایک چار ملاح سامنے سے آئے۔ خوجی نے جو ان کو غور سے دیکھا تو ہنسے "مچھئی"۔ میرزا صاحب سے پوچھا "یہ کون ہیں بھئی ان کی تو کچھ وضع ہی نرالی ہے۔"

انھوں نے کہا "یہ ملاح ہیں دن رات سمندر میں رہتے ہیں جب دیکھئے جہاز پر۔"

خوجی نے پوچھا "بھلا یہ ہماری بولی سمجھ لے گا؟ اُردو جانتا ہے کہ نہیں؟"

میرزا صاحب نے کہا "ہاں ہاں جانتا کیوں نہیں ہے ہزاروں ہندوستانیوں کو لے گیا ہے اور خوب سمجھتا ہے۔"

خوجی نے ایک بڈھے ملاح سے پوچھا "کیوں بھئی ہم کو پانی باتوں

تو نہ چلنا ہوگا کسی مقام پر "۔

ماجھی نے کہا " ہونہہ۔ کیا دھرتی پر چلنا ہے "

" بھلا افیم کھانے کی تو جہاز پر ممانعت نہیں ہے "

" نہیں بہت سے آدمی افیم گھول کر پیا کرتے ہیں جس کا جو جی چاہے کھائے "

" اے میں تیری زبان کے قربان۔ واہ میری جان بس جنیا بیگم پاس ہوں تو مزے ہیں۔ بھلا کیوں میاں جہاز پر کوئی جگہ ایسی بھی ہے جہاں سے سمندر نظر ہی نہ آئے اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں سچ بتانا اُستاد اجی ہم پانی سے بہت ڈرتے ہیں بھائی "

" ہم آپ کو ایسی جگہ بٹھا دینگے جہاں پانی آسمان کچھ سوجھ ہی نہ پڑے "

" صدقے۔ قربان۔ بڑے دوست ہو ہمارے۔ ایک بات اور بتا دو۔ گنے ملتے جائیں گے راہ میں یا اُن کا کال ہے "

" گنے وہاں کہاں کیا کچھ منڈی ہے اپنے ساتھ چاہے جتنے لے چلئے "

" ہاں گنڈیریاں تازی تازی کھانے میں نہ آئیں گی۔ بھلا حلوائی کی دوکان تو ہوتی ہوگی آخر یہ اتنے شوقین افیمی جو جاتے ہیں تو کھاتے کیا ہیں سنکھیا۔ کھاجا برفی۔ پیڑے لڈو یہ سب ملتا ہے یا ندارد "

" اجی جو چاہو ساتھ رکھ لو "

" اور جو منہ ہاتھ دھونے کو پانی کی ضرورت ہو تو کہاں سے آئے "

آزاد اس سوال پر جھلا کر بولے " پاگل ہے۔ کون مسخرا اتنا نہیں سمجھتا کہ سمندر میں جانا ہے اور پوچھتا ہے کہ پانی کہاں سے آئے گا۔ سب پانی پیئں گے تم پیاسے مرو گے۔ دشت کربلا ہے۔ احمق "

خوجی نے آزاد کی طرف غور کر کے کہا " ایک کیوں اُلجھ پڑے۔ آپ سے

پوچھتا کون گیدی ہے" اور پھر ملّاح سے پوچھنے لگے "کیوں جی بھلا ہم گنے یہاں سے باندھ لے چلیں اور گنڈیریاں بنائیں اور جہاز پر چوسیں مگر چھلکے پھینکیں گے کہاں آخر ہم تو صبح و شام دو چار پونڈے کھایا چاہیں پھینکیں کہاں"

آزاد بولے "یہ بڑی ٹیڑی کھیر ہے ہم بتا دیں گے آپ بدحواس نہ ہوں"

خوجی نے پھر پوچھا "اس کی ممانعت نہیں ہے کہ کوئی پینک میں نہ ہو"

مانجھی نے ہنس کر کہا "نہ"

خوجی نے پوچھا "اور جو قرولی باندھے ہو تو ہرج تو نہیں ہے کچھ یا مثلاً قرابنچہ ہو"

"چاہے ہو مگر الائسنس ضرور ہونا چاہیئے"

"ہوں. دیکھئے ایک بات معلوم ہوئی نہ. اچھا یہ سب تو ہوا اب دو دو باتیں اور ہو جائیں. ایک تو یہ بات پوچھنی ہے کہ بہروپئے تو جہاز پر نہیں چڑھنے پاتے"

"چاہے جو سوار ہو. دام دے سوار ہو لے کسی کا وہ نہیں. ہلُو"

"اجی ہلُو گوڈالو بھاڑ میں ہمارے سوال کا جواب دو کمھار تو نہیں ہوتے"

"آج تلک کوئی کمھار گیا نہیں. یاد نہیں پڑتا"

"اے میں تیری زبان کے پھر قربان بڑی ڈھارس ہوئی خیر کمھار سے تو بچے. باقی رہا بہروپیا. اس گیدی کو سمجھ لونگا. اتنی قرولیاں بھونکوں کہ یاد ہی تو کرے"

"اتنی باتیں تو کسی نے بھی نہ پوچھی تھیں. اب کچھ اور پوچھو گے"

"ہاں بس ایک بات اور وہ بھی دو پٹی یہ تو قید نہیں ہے کہ صبح و شام ہر شخص ضرور ہی نہائے. اگر یہ قید ہوئی تو جانے والے پر تین حرف ہم کوئی جیلخانہ میں تو ہوں گے نہیں"

"آپ چاہیں عمر بھر نہ نہائیں"

"اے میں تیری زبان کے قربان"

"افیم بہت کھاتے ہو معلوم دیتا ہے"

خوجی مسکرا کر بولے "ہاں خوب پہچان گئے۔ آپ قیافہ شناس بھی ہیں خیر سے۔ یہ تم کیونکر بوجھ گئے بھائی۔ شوق ہو تو گھولوں۔

"وت۔ بس الگ رہیو۔ ہم افیم کو چھوتے تک نہیں"

خوجی بگڑ گئے "او گیدی ٹکے کا آدمی تم اور جھک مارتا ہے۔ نکالوں قرولی"

آزاد نے روکا "ہاں ہاں خواجہ صاحب دیکھئے دیکھئے جانے دیجئے گا۔ ذرسی قرولی میان ہی میں رہے"

میرزا صاحب بولے "جناب خواجہ بدیع صاحب آپ اپنی طرف دیکھئے درگذر کیجئے بدتمیز ہے"

خوجی اکڑ کر بولے "خیر آپ لوگوں کی خاطر ہے ورنہ اُدھیڑ کے دھر دیتا پاجی کو" مجھے بھی کوئی اور سمجھا تھا یہاں ضیف اللہ کے اکھاڑے میں کشتی لڑا کئے ہیں" دل لگی ہے کچھ کہنے لگا۔ وت۔ اچھی دو دبک ہے اسوقت آپ لوگ بیچ میں نہ پڑتیں تو پھر کس ہی نکال دیا ہوتا"

میرزا بولے "ذری غور سے دیکھئے کہیں بہروپیا تو نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں۔ وہی گیدی ہے"

پھر گھر چلے آئے۔

کچھ دن بعد بمبئی سے چلنے کی تیاری ہوئی۔ چلتے وقت خوجی نے کہا "مولانا محمد آزاد صاحب کہئے اب چلنے کا وقت قریب آیا۔ کچھ خواجہ بدیع کی بھی فکر ہے۔ وہ قرولی لیتے ہی لیتے رہ گئے۔ افیون کا کیا بند و بست کیا ہے یار۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ افیون راہ میں نہ ملے اور ہم جیتے جی مر جائیں۔ بازار سے پونڈے کی پھاندی ادھ

کوئی ساٹھ نشتر کتارے تو نازک نازک سے منگوا دیجئے۔ میرا بھائی۔ نہیں تو میں جیتا نہ پھروں گا۔"

الغرض چلنے کا وقت آ گیا اور میاں آزاد نے اپنا اور خوجی کا اسباب باندھا بگھی تیار ہوئی سب سامان چوکس۔ آزاد اور خوجی اور میرزا صاحب بگھی میں سوار ہو کر ساحل بحر کی طرف چلے۔ خوجی نے بے ڈھب سے بے ڈھب سوال ابھی سے شروع کر دئیے۔

"ہمیں کوئی نہانے کو کہے گا۔ تو ہم قرولی ہی بھونک دیں گے۔"

میرزا صاحب نے کہا "تو جب کہے نہ کوئی"

"ہاں بس اتنا یاد رکھئے گا ذری"

"کچھ زبردستی تو ہے نہیں۔ چاہے نہائیے۔ چاہے نہ نہائیے کچھ کسی کا اجارہ ہے"

"دیکھئے ہم پکر جتائے دیتے ہیں کہ ہم گنا چوس چوس کر سمندر کے باپ میں پھینکیں گے اور جو کوئی بولے گا تو ہم دبوچ بیٹھیں گے ہاں ایسے ویسے نہیں یہاں"

آزاد بولے "اجی اب زیادہ فکر نہ کیجئے میں نے سب بندوبست کر لیا ہے"

آپ کے انتظام کو بس دور ہی سے سلام "خوجی بولے۔ اور پھر کہنے لگے "خدا کرے افیم روز کی روز ملتی جائے۔

"افیم منوں ٹنوں لیجئے" آزاد نے کہا۔

"اور قرولی"

"واہی ہو خاصے"

واہ کیا شرافت ہے آپ کی۔ گالیاں ہی دینے لگے واہ قبلہ"

آخر کو بندرگاہ پر پہونچ گئے۔ میاں آزاد جسوقت ساحل بحر کے قریب گئے تو خوجی نے کہا کہ حضرت آپ تو کچھ ڈھیلے ڈھالے سے معلوم ہوتے ہیں"

اسوقت خوجی نے جو غور سے پانی کی صورت دیکھی اور گول گول دیدے پھاڑ کر لہروں اور ان کے تھپیڑوں پر نظر ڈالی تو کفن پھاڑ کر چیخ اٹھے اور کوئی پچاس قدم اُلٹے پاؤں بھاگے۔ وہاں پر خدا جانے کسی مصلحت سے کسی نے ایک میخ گاڑ رہی تھی۔ ٹھوکر جو کھائی تو ارار ادھوں۔ لڑھکتے ہی حضرت نے غل مچایا "بھلا گیدی۔ یہاں بھی ہماری جان کا گاہک آن ہی موجود ہوا۔ اچھا۔ بچہ ٹھہر تو جاؤ۔ اتنا چٹیا یا ہوکہ عمر بھر یاد ہی تو کرے مردک۔ ہم جو پیٹھ کی طرف مُنھ اور مُنھ کے رُخ دُم کئے بھاگے جاتے تھے تو گیدی نے اچھی گھات پائی۔ ایک ٹنگنی چلتے چلتے بتا ہی دی" اب ادنا بھے پڑے بہروپئے کو للکار رہے ہیں۔ مگر اُٹھنے کی قسم کھائی ہے"

اتنے میں میرزا صاحب اور آزاد بھی کلے پر جا پہونچے۔

آزاد بولے "بس اُٹھیئے اُٹھیئے"

خوجی جھاڑ پونچھ کر اُٹھے اور بولے "پہلوان کبھی چت گرے ہی گا نہیں۔ جب گرے گا پٹ۔ گرا اور زمین پکڑ لی"۔

"اب سفر کی تیاری ہے نا" آزاد نے کہا"

"توبہ کر بندے" خوجی نے "بھائی خشکی خشکی چلو تو بندہ ساتھ ہے ورنہ سلام۔ پانی کی صورت دیکھی اور زہرہ آب ہو گیا۔ میں تو راستے ہی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر کھنگر بن جاؤں گا۔ روم تک جا کون سکے گا"

یہ کہکر میاں خوجی بگٹٹ بھاگے۔ آزاد اور میرزا صاحب بھی ساتھ ہی جھپٹے۔ میرزا نے آزاد کو رائے دی" حضرت یہ یوں نہیں جانے کے ان کو خوب افیم پلوائیے اور الو بنائیے جب یہ نشے میں غیں ہوں تو لاد لو کر جہاز پر بٹھا دیں گے۔

اتنے میں دونوں خوجی کے پاس پہونچ گئے اور ان کو پکڑ لیا۔

"ارے میاں خوجی" آزاد بولے۔

"خواجہ صاحب نہیں کہتے۔ خوجی کی ایسی تیسی۔ خواجہ بدیع خاصہ نام ہے۔ خوجی کیا معنے"

"خواجہ بدیع صاحب قبلہ۔ آپ نے آج افیم تو پی ہی نہیں"

"یہ کاہے سے معلوم ہوا آپ کو؟"

میرزا نے کہا "آنکھوں سے جمائیوں سے"

آزاد نے کہا "کیوں صاحب آپ نے افیم پیتے دیکھا تھا انھیں"

"جی نہیں میں تو خود ٹوکنے کو تھا"

"ہاں حضرت کچھ نشہ تو ہم کو بھی ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ بیشک افیم نہ پی ہوگی لاحول ولا قوۃ یہ تو اپنے ہوش کا حال ہے"

آزاد نے کہا "اس وقت جمائی بھی آئی آپ کو۔ وہ لیجئے دوسری آئی خدا ہی خیر کرے"

میرزا نے ٹکڑا لگایا "اور تیسری آئی۔ واللہ اسوقت تو جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی"

خوجی بولے "بھائی بندہ تو بے پیئے اب بات تو کرنے کا نہیں"

میاں خواجہ بدیع اپنے اسباب کے پاس واپس آئے۔ پیالیاں نکالیں افیم گھولی اور چسکی لگائی۔ آزاد ہشاش بشاش کہ تہ پر تہ جمائی۔ میرزا خوش کہ ہماری ترکیب کارگر ہوئی۔ خوجی نے افیم جو پی تو مارے ہوس کے ذرا زیادہ پی گئے۔ پیتے ہی تھیں آنکھیں بیر بہوٹی۔ آزاد نے ایک چھپر کھٹے پر لاد کر حضرت کو کشتی پر سوار کیا اور وہاں سے جہاز پر۔ خوجی کو سر و پا ہی کی خبر نہیں ورنہ وہ رولا لاتے کہ الاماں۔

(۵)

بحر زخار ناپیدا کنار میں ایک جہاز غل محبوبان کو کنارے ٹھکیلیاں کرتا

چلا آتا ہے سوائے لاجوردی آسمان اور نیلی چادر آب کے کالے کوسوں تک کچھ اور نظر ہی نہیں آتا ہے۔

میاں آزاد عین عالم جنوں میں دیوانہ وار گھومتے تھے کہ اتنے میں جہاز کے ایک کونے سے آواز آئی " او گیدی نہ ہوئی قرولی۔ نہ ہوا تپنچہ۔ ورنہ لاش پھڑکتی ہوتی اسوقت"۔ میاں آزاد سمجھ گئے کہ حضرت خواجہ بدیع صاحب کو دور سے شیطان نے انگلی دکھائی۔ وحشت سر پہ سوار ہوئی قرولی یاد آئی۔ ڈرے کہ ایسا نہ ہو کسی یورپین سے لڑ پڑیں۔ افیم کی ترنگ میں بیوجہ جھگڑ پڑیں۔ قریب جاکر پوچھا "کس پر بگڑے کیوں چلّایا۔ کون یاد آیا کس پر غل مچایا۔

خوجی بولے" اجی جاؤ بھی یہاں شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔ واللہ گرفتار ہی کر لیا تھا۔ گیدی کو پاتا تو اتنی قرولیاں لگاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آتا۔ مگر میرا پاؤں پھسل گیا اور وہ نکل گیا"

" یار ایک آنچ کی ہمیشہ کسر رہ جاتی ہے خیر اتنی چپر غٹو کرنا گیدی کو۔ یہ تھا کون "

" تھا کون؟ ہوتا کون۔ وہی بہروپیا مردود اور کس کو پڑی تھی بھلا"

" بہروپیا "

" جی ہاں بہروپیا۔ یہ بڑا تعجب ہوا آپ کو "

" بھئی ہاں تعجب کہیں لینے جاتا ہے۔ کیا بہروپیا بھی جہاز پر سوار ہو لیا ہے۔ بڑا الاگو ہے بھئی "

" سوار نہیں ہوا تو آیا کہاں سے۔ ٹھہر جا گیدی تو خواجہ بدیع جو قرولیاں ہی نہ بھونکی ہوں انشاء اللہ "

" کیا سوتے تھے خوجی یا پینک میں تھے؟

"خوجی کی ایسی تیسی مردود کی۔ پھر تم نے خوجی کہا ہم کو۔ کیوں جی؟"

"معاف کرنا بھئی قصور ہوا۔"

"واہ اچھا قصور ہوا۔ کسی کو دو جوتے لگا دیئے اور کہئے قصور ہوا۔ خواجہ بدیع صریح مجھ کمبخت کا نام تھا۔"

"نام تھا۔ کیا اب نہیں ہے"

"جب دیکھو خوجی خوجی خوجی کی ایسی تیسی مردک کی۔"

"جناب خواجہ بدیع صاحب یہ بہروپیا کمبخت کہاں سے آ گیا۔"

"ارے صاحب اب تو خواب میں بھی آنے لگا۔ ابھی ابھی میں سوتا تھا۔ آپ موجود۔ میرے ہاتھ میں اسوقت افیم کی ڈبیا تھی پھینک کے ڈبیا اور لیکے کنارا جو پیچھے جھپٹا تو دو کوس نکل گیا۔ مگر شامت اعمال سے ایک مقام پر ذرا سا پانی پڑا تھا۔ روح فنا ہو گئی۔ پھسلا تو ادارا دھوں۔"

"یار کوئی تدبیر ایسی کرو کہ بہروپیا پکڑ لیا جائے۔"

"تم بولو نہیں۔ بس دیکھتے جاؤ صبح شام میں گرفتار ہی کیا چاہتا ہوں گیدی کو۔"

"لیکن اب ذرا ہوشیار سوئیے گا۔ بہروپیا گیا جہنم میں۔ ایسا نہ ہو کوئی حریف روپیے دو پیسے غائب کر دے۔ بیوقوف کہیں کا۔ ابے گدھے یہاں بہروپیا کہاں۔"

"بس خردی بزرگی ہو چکی ہمیں جو کہے گا سنے گا بھی۔ بس رخصت"۔ یہ کہکر اپنا بوریا بدھنا اٹھایا اور بولے"بندہ جاتا ہے۔ یارانہ ہو چکا۔ اور سنئے ہم گدھے ہیں۔ کیا جانے کتنے گدھے ہم نے بنا ڈالے۔"

"چلئے گدھے نہیں گدھے گر بھی۔ لیکن جائیگا کہاں یہ بھی خشکی ہے کچھ معقول!"

"او ہمارے کیتان گی۔ او ناخدا۔ جہاز دو ۔۔۔ تلے"

"ایں جہاز رو کے لے کیا خوب!"

"ارے جہاز روک لے او ناخدا"

"یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ خدمتگار نے آکر آزاد صاحب سے کہا حضور حاضری چنی ہے"

جہاز پر آزاد کے بہت کافی دوست ہو گئے تھے۔ ان میں ایک انگریز افسر لفٹننٹ اپلیس اور ان کی بیوی وینشیا اور ایک بذلہ سنج حضرت بھی تھے۔ یہ لوگ ایک مقام پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بذلہ سنج نے کہا "آئیے آئیے میاں خوجی لڑھکتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ بذلہ سنج نے کہا "آئیے آئیے بس آپ ہی کی کسر تھی"

"مجھے بیٹھے بیٹھے" خوجی بولے "خیال آیا کہ کسی سے پوچھوں تو یہ سمندر ہے کیا شے" اور پھر بذلہ سنج کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ کیوں حضرت یہ سمندر کیا شے ہے اور کس فقیر کی دعا سے بنا"

بذلہ سنج بولے "تاریخ الحمقا میں اس کا کل حال درج ہے۔ اگلے وقتوں میں ایک ملک تھا گھامڑ نگر۔ اس ملک کے باشندے بڑے جری اور سپاہی آدمی تھے۔ مگر پستہ قد"

خوجی نے موچھوں پر تاؤ دیا اور بولے "ہوں ہوں۔ پستہ قد تو جری ہوتے ہی ہیں"

لیکن کوئی باشندہ بغیر قرولی باندھے گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ قرولی ہو قرابنچہ سہی"

خوجی اکڑ بولے "کیوں میاں آزاد۔ وہی بات آگئے آئی نہ"

بذلہ سنج بولے "ایک ان لوگوں میں عیب تھا۔ سب مرد افیم پیتے تھے"

خوجی نے تیوڑھی چڑھا کہ کہا "او گیدی"

آزاد نے روکا "ہاہیں۔ ہاہیں۔ تشریف۔ یورپین جنٹلمین سے یہ سخت کلامی"

"ہم تو سر سے پاؤں اور پاؤں سے سر تک پھنک گئے۔ آپ شریف لئے پھرتے ہیں۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ ڈھیر کر دیتا او گیدی۔"

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ جہاز کے کپتان نے سب کو اطلاع دی کہ ایک گھنٹے میں بڑی سخت آندھی آنے والی ہے مستعد ہو رہو۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی سب کے ہوش و حواس غائب ہو گئے اور جہاز پر کھلبلی مچ گئی۔ خوجی جا کر اپنی جگہ سو رہے۔ طوفان آیا۔ ہر شخص ایک بیقراری اور مایوسی کے عالم میں تھا جہاز بھر میں کہرام مچا تھا۔ مگر خوجی افیمی لمبی تانے سو رہے تھے۔ میاں آزاد نے جگایا "خواجہ صاحب اُٹھئے طوفان آیا ہے" حضرت نے لیٹے ہی لیٹے جھنجھلا کر فرمایا "چپ گیدی ہم نے خواب میں ہیرو پیا پکڑ پایا ہے" میاں آزاد نے اُن کو وہیں چھوڑا اور آ کر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے میں جہاز کے افسروں کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

جب طوفان بہت بڑھا اور جہاز کے ڈوبنے کا خوف ہوا تو خوجی چونک کے اُٹھے۔ کہرام برپا دیکھ کر اور کچھ نہ سوجھی طوفان کو گالیاں دینے لگے "او محبت او بے ایمان طوفان۔ او بیرحم طوفان اور سنگدل طوفان۔ او گیدی۔ کب کا بدلہ لیا۔ ہائے اسی سے تو میں پانی کی صورت سے کانپتا تھا۔ اس پانی کو آگ لگے مار ہی ڈالا......"

میاں آزاد اسوقت لوگوں کو لائف بوٹ پر آنے میں مدد دے رہے تھے۔ ایک لہر آئی جہاز تہ و بالا ہونے لگا۔ وہ گئی تو دوسری آئی ہنوز جہاز سنبھلنے نہ پایا تھا کہ تیسری موج کے تھپیڑوں نے آفت ڈھائی میاں آزاد بکمال شجاعت و استقلال پھر جہاز پر سے کودنے ہی کو تھے کہ ناخدا نے میاں خوجی کو بھی اُن کے لائف بوٹ میں لہرا کر پہنچایا آتے ہی اُنھوں نے

غل مچایا" میاں کوئی بندہ خدا اوری لپک کر ہماری ڈبیا لے آئے۔ آزاد کو جو پایا چمٹ گئے" بھائی آزاد جب اتنا بڑا جہاز نہ بچا تو یہ ننھی ننھی کشتیاں بھلا کیوں کر بچیں گی؟" آزاد نے کہا" خدا مالک ہے"

الغرض خدا خدا کر کے لائف بوٹ مع الخیر ساحل جزیرہ پیرم تک پہونچ گیا۔ جب سب قرار سے بیٹھ گئے تو خوجی نے کہا" دیکھیں ہماری افیم کی ڈبیا کس خوش نصیب کے ہاتھ لگتی ہے"

آزاد کو ہنسی آئی تو جھلا کر کہنے لگے" پھر اسمیں ہنسی کی کیا بات ہے۔ آخر ہنسے آپ کس بات پر۔ اُف واللہ جہاز کے ڈوبنے کا کس مردک کو رنج ہو۔ اپنے حساب۔ مرگ انبوہ جشنے دارد مگر افیم ہائے افیم۔ چنیا بیگم کے ڈوبنے کا البتہ کمال رنج ہے"

جزیرہ پیرم سے روانہ ہو کر مالٹا پہونچے۔ یہاں دو دن قیام کے بعد خوجی نے میاں آزاد سے دو پیسے لئے اور ایک دوکان پر پہونچے" افیم دو افیم" دوکاندار منھ تاکتا ہے کہ یہ بک کیا رہے ہیں۔

"ہم افیم مانگتے ہیں۔ اوبے میاں افیون۔ افیون۔

دکاندار نے ہاتھ سے کہا کہ ہم سمجھتے نہیں۔

"عجب جانگلو ہے۔ ابے ہم افیم مانگتے ہیں"

دکاندار ہنسنے لگا۔

کیا پھٹی جوتی کی طرح دانت نکالتا ہے۔ ابے گیدی یہ نہ ہوئی قرولی ورنہ دھواں اس پار ہوتا۔۔۔۔ لے بس اب دل لگی ہو چکی لاؤ افیم لاؤ"

پیسے حضرت نذو شاہی دکھاتے ہیں۔ اتنے میں میاں آزاد پہونچے۔

"این خوجی"

"جھک مارتے ہیں آپ۔ خوجی پر لعنت مردک پر"

"ارے غضب۔ لاحول ولا قوۃ۔ معاف فرمائیے گا۔ جناب خواجہ بدیع صاحب"

"ارے دو کروڑ مرتبہ سمجھا چکا کہ خوجی مجھ بدبخت کا نام نہیں میں خواجہ صاحب الشہیر بہ خواجہ بدیع صاحب ہوں۔ خوجی خوجی اور دو ہی کروڑ بار معاف بھی کر چکا"

"یہاں خمیداری ہوتی ہے"

"اجی یہاں سب جانگلو ہی جانگلو رہتے ہیں۔ ایک گھنٹہ بھر سے افیم مانگ رہا ہوں۔ سُنتا ہی نہیں"

"پھر کہنے سے تو آپ بُرا مانتے ہیں۔ بھلا یہ بازو بیچتا ہے یا افیم اور یہ بڈو شاہی پیسے کیا ہونگے۔ بالکل گوکھے ہی رہے۔ اب بتاؤ جانگلو تم ہو یا وہ ہے۔ چلو ہم افیم دلوادیں۔ آؤ۔"

"قربان۔ قربان واللہ تن مُردہ میں از سر نوجان آگئی"

دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ آزاد نے کہا "بھئی اب ہمارا کہنا مانو ہم کو تو ٹرکی جانے دو اور تم چلدو ہندوستان"

خوجی نے اپنا منھ پیٹ لیا "واہ۔ واہ۔ واللہ میں نہ مانوں گا۔ اور اب تنہا واپس کس سے جایا جائے گا حضرت بندے کو معاف کیجے۔ اب میں ساتھ چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ بھئی افیم البتہ دلوادو۔ اور میں چلا جاؤں گا تو تم لڑوگے کس کے برتے پر"

"چہ خوش آپ ہی کے برتے پر تو میں لڑنے جاتا ہوں"

"کون۔ قسم کھا کے کہتا ہوں۔ جب سُنئے گا کہ خواجہ بدیع صاحب نے توپ میں کیل لگا دی"

جی اس میں کیا شک ہے

"شک وک کے بھروسے کبھی نہ رہیئے گا۔ اکیلی لکڑی چولھے میں کبھی نہیں جلتی دیکھئے جسوقت بدیع صاحب اسپ باد رفتار پر سوار ہوتے ہیں اور اکڑ کر بیٹھتے ہیں تو پچی بنے ہوئے اسوقت اچھے اچھے جنڈیل اور کنڈیل تک جھک جھک کے تعظیم کرنے لگتے ہیں"

آزاد نے مسکرا کر کہا "بھئی واللہ جنڈیل اور کنڈیل کی تم نے ایک ہی کہی مگر واسطے خدا کے میدان جنگ میں میرے ساتھ نہ جائیے گا۔ بلی بخشنے چوہا لنڈورا ہی جی جائے گا"

خوجی بہت ہی بگڑے اور اکڑ کر بولے واللہ ایک کٹاری سے لشکر کے لشکر اور پرے کے پرے نہ صاف کر دیے ہوں تو خواجہ بدیع نہیں" پھر موچھوں پر تاؤ دیکر کہا "انشاء اللہ دیکھئے تو جائیے۔ مگر یار جو اکی جہاز غرقاب ہوا تو بس گئے ہی گذرے"

میاں آزاد اور خوجی دوسرے دن جہاز پر سوار ہوئے۔ میاں آزاد حسن آرا کو یاد کر کے کچھ غمگین ہوئے میاں خوجی نے سمجھایا "دیکھو بھئی آزاد ہماری تمھاری حالت اب ایک ہے تم معشوق صبیح ہم معشوق ملیح کی مفارقت میں سرد جھنتے ہیں تم روتے ہو ہم دیوانوں کی طرح تنکے چنتے ہیں تمھیں حسن آرا بیگم ہمیں چنیا بیگم نے کہیں کا نہیں رکھا۔ دل بہلائیے دونوں کی کیفیت ایک ہے اسوقت ذرا دل بہلاؤ۔ دو گھونٹ پانی پیو کھانا کھاؤ۔

آزاد نے کہا "سبحان اللہ غم غلط کرنے کی کیا خوب تدبیر بتائی ہے ہماری تو جان پر بن آئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کھانا کھاؤ۔ دل بہلاؤ"

خوجی نے کہا "بھئی دادی جان ایک مثل کہا کرتی تھیں کہ ٹکڑے کھائے دل بہلائے۔ پیٹ بھرا تو گھر کو آئے۔ میاں چند روزہ زندگی ہے لئے کوئی بھی

رنج کرے۔ بجز غم حسین کوئی غم ہی نہ کیا "
" خیر اس عشق کا بُرا ہو جس نے ہمیں دین کا رکھا نہ دُنیا کا "
" ہے تو ایسا ہی مگر "
" اب چاہے جیسی سختی پڑے جھیلیں گے ضرور۔ اگر ہم مر گئے تو تم حسن آرا کو ہماری وفات کی اطلاع دوگے یا نہیں "
" تم مروگے۔ کیا طاقت "
" یہ بھی اختیاری امر ہے کچھ "
" کیا مجال مرنا نہ ہوا ہنسی ٹھٹھا ہوا۔ اور یہ ہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی تھی "
" این کیا خوب "
" کیا خوب سیمت "
" سن تو لو "
" غیر ممکن بات کوئی اور سنتے ہونگے۔ دعویٰ بے دلیل مہمل ہوتا ہے۔ ثبوت دو کہ تم مر جاوگے "
" کیا کوئی مرنے سے انکار بھی کر سکتا ہے "
" تو مرتے ہم ایسے ہیں دُبلے پتلے بوڑھے افیمی نہ کہ تم ایسے ہٹّے کٹّے چاق چوبند "
" اور شاید ہم ہی تمھارے پہلے مر جائیں "
" واہ اجی تم ہم کو مار کے مروگے "
" خیر "
" خیر کیا معنے۔ کچھ زبردستی ہے۔ ہم تم کو مرنے نہ دیں گے۔ ادھر تم کو نزع کی حالت میں دیکھا اور ہم نے زہر کھا لیا اب فرمائیے پہلے کون مر گیا۔
" اگر بالفرض محال ہم مر گئے تو حسن آرا بیگم کو ضرور اطلاع دینا "

"کیا مجال"

"نہ اطلاع دو گے"

"ہرگز نہیں"

"آخر وجہ"

"اگر ہم ڈوبتے ترتے لڑھکتے پڑھکتے وہاں تک پہونچے تو جا کے کہیں گے
کہ ایک عورت کو میاں آزاد عقد نکاح میں لائے اب مزے سے روم میں زندناتے
ہیں۔ ہم یہ نہ کہیں گے کہ آزاد جان بحق تسلیم ہوئے یہی کہیں گے میاں آزاد وہاں گلچھرے
اڑا رہے ہیں"

"تسلیم خوب حق دوستی آپ ادا کریں گے"

"یہ فعل بھی خالی از حکمت نہیں"

اور وہ حکمت کیا ہے؟ ہم بھی سنیں۔

"اگر آپ کا کوئی دوست بیوقوف احمق گھامڑ آپ کے مرنے کے بعد
حسن آرا کو لکھ بھیجے کہ میاں آزاد عالم جاودانی سے پدرود کر گئے"

"کس سے پدرود کر گئے"

"عالم جاودانی سے۔ کیوں عالم جاودانی سے پدرود کرتا یعنی مر جانا۔

"جی درست۔ بجا۔ عالم جاودانی سے پدرود کر کے گئے کہاں عالم فانی؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ مطلب یہ کہ عالم فانی سے پدرود کر گئے خیر اگر لکھ بھیجیں
کہ میاں آزاد مر گئے یوں ہی سہی تو حسن آرا کی جان پر بن آئے یا نہیں۔ اس
بیچاری کے دل پر کیسی گذرے۔ اے ہے۔ زندہ درگور۔ سر پٹک پٹک کر
دم توڑے اور جو یہ سُنے کہ آزاد ہیں تو جیتے جاگتے مگر عاشق صادق نہ تھے
جھوٹے اور بدمعاش نکلے تو قسم خدائے پاک کی تمھارے نام سے نفرت

ہو جائے اور بیچ تو قریب کھٹکنے نہ پائے۔ اب بولو ہے اچھی ترکیب یا نہیں۔ نہ کہو گے۔

"ہاں ہے تو اچھا"

خوجی اکڑ گئے "دیکھا۔ پیر شو بیا موز۔ بوڑھے آدمی ڈبیا میں بند کر رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم تو کہتے تھے کہ ٹرکی جانے کا خیال دل میں نہ لاؤ۔ مزے سے ہندوستان میں ونڈناؤ۔ تم نہ مانو تو کوئی کیا کرے۔ کہتے تھے کہ عشق کے جھگڑے میں نہ پڑنا۔ نہ مانا۔ نہ مانا۔ اب بھگتو۔

آزاد کا غم غلط نہ ہوا تو خوجی بولے "یا تو اس درجہ جوانمردی کے ذرا سے اشارے کی دیر تھی۔ دن سے جہاز پر سوار ہو گئے۔ وطن مالوف کو خیر باد کہہ کر رُوم چلے اور یا اب اسقدر پریشانی اور حیرانی اور سرگردانی ہے کہ بات کرنا تک دوبھر ہے۔ یہ کیا بات ہے دل کو خوب مضبوط رکھو۔ کوئی کتاب پڑھو۔ تم اتنے لائق فائق آدمی ہو ہم نے دس بارہ دن سے تم کو پڑھتے نہیں دیکھا ان دنوں میں دن رات مطالعہ کتب کرتے تھے دل بہلتا تھا اب آجکل یکس قلم پڑھنا القط کر دیا۔ وحشت نے آن دبوچا عشق نے ٹیٹوا لیا۔

"ہاں سچ کہتے ہو سٹری ہو تو کیا ہوا مگر اسوقت ٹھکانے کی بات کہی"

"ارے یار اول تو ہمیں اُمید ہی نہیں کہ ہندوستان واپس جائیں اور اگر خوش قسمتی سے زندہ بچے اور ہندوستان کی صورت دیکھی تو زمین پر قدم نہ رکھیں گے۔

"زمین پر تو آپ اب بھی قدم نہیں رکھتے ہیں"

"ہم کہیں گے تم لوگ کیا جانو مالٹا کہاں ہے بھلا بتاؤ جزیرہ پریم کدھر ہے"

"پریم نہیں پیرم"

"بس یہی تم میں سخت عیب ہے۔ وہ پریم کہا تو کیا اور پیر کہا تو کیا"

"ہاں تو پھر خوجی کہا تو کیا اور خواجہ بدیع صاحب کہا تو کیا"

خوجی ہنس دئے۔ میاں آزاد اُن کو لیکر ایک کوٹھی میں گئے اور ایک آدمی کے ہاتھ افیم منگوائی۔ افیم دیکھتے ہی میاں خوجی کھِل گئے سیکڑوں ہی دعائیں دیں" بھائی آزاد واللہ اسدم تو تو نے مسیحائی کی خدا گواہ ہے جلا لیا"

الغرض مالٹا سے روانہ ہو کر اسکندریہ پہونچے۔ وہاں کے ایک ہوٹل میں فروکش ہوئے۔ کھانا کھانے کا وقت آیا تو خوجی رنگ لائے بولے" لاحول ولاقوۃ یہاں کھانے والے کی اپنے حساب ایسی تیسی۔ ہم کوئی بات خلاف شرع نہ کریں گے۔ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ذرا سی تکلیف کے لئے ہم اپنا مذہب نہ دیں گے۔ آپ شوق سے جائیں اور مزے کھائیں۔ ہم درگذرے"

"اور افیم کھانا خلاف شرع نہیں ہے"

"ہرگز نہیں اور اگر ہے بھی تو کیا فرض ہے کہ ایک امر خلاف شرع کریں تو کل امور شرع کے خلاف ہی کریں"

"ایسے تو نامعقول یہ کس گدھے نے تجھ سے کہا کہ یہاں کھانا کھانا شرع کے خلاف ہے۔ میز کرسی دیکھی اور بک اُٹھے کہ شرع کے خلاف ہے اگر لحم خوک یا شراب ہو تو خیر ہم کہیں خلاف شرع ہے اس میں کیا ہے صاف ستھرا مقام۔ مسلمان پکانے والے مگر خبط کا کیا علاج ہے۔

"جی وہ خبط ہی سہی آپ رہنے دیجئے۔ ہونھ!!!"

"ہونھ۔ ہونھ۔ کیا معنے۔ کھانا کھاؤ نہیں جہنم میں جاؤ"

"جہنم میں وہ جائیں گے جو یہاں کھائیں اور اینجانب سیدھے بہشت میں دندناتے جائیں گے"

"جی اس میں کیا شک: وہاں افیم کہاں سے آئے گی"

ہم کوئی نان بائی کی دوکان سے کباب اور روٹی یا قرص خانی اور گوشت

یا پلاؤ مُول لے کے کھائیں گے۔ مسلمانوں ہی کا تو ملک ہے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دو ترکی آئے اور اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگے۔

خوجی نے پہلے تو کہا کہ یہ مسلمان نہیں ہیں۔ پھر کہا شاید ہوں کوئی ایسے ویسے۔ آزاد نے کہا ایسے ویسے نہیں۔ خاص الخاص ترک ہیں اور رُوم میں سب میز کرسی پر نصاریٰ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ خوجی کو ابتک اس بات کا یقین نہ آیا اور بولے کہ "اگر مسلمان ہیں تو مذہب کے خلاف کرتے ہیں"۔

آزاد ان ترکوں سے باتیں کرتے رہے اور پھر ترکی کانسل سے ملنے سے گئے۔ حضرت خواجہ بدیع صاحب کو ہوٹل ہی میں چھوڑ گئے۔

خوجی سوچے کہ بیٹھے بیٹھے مکھیاں کب تک مارا کریں گے۔ آؤ دیکھیں کوئی ہندوستانی بھائی ہو تو گپیں اُڑائیں۔ اِدھر اُدھر ٹہلنے سے خیر کا ایک ہندوستانی سے ملاقات ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

خواجہ صاحب نے پوچھا "کیوں بھئی اسکندریہ میں افیم ملتی ہے۔ کوئی چانڈو خانہ ہے۔ کہیں مدک اُڑتی ہے۔ چرس کی لو آسمان کی خبر لاتی ہے یا نہیں"۔

ایک دم سے تین چار سوال کئے اور اُس بیچارے کو دم بھی نہ لینے دیا وہ اُن سے بھی اُستاد نکلے۔ کسی بات کا جواب ہی نہ دیا۔ خوجی تیکھے آدمی اِن کو بھلا یہ تاب کہاں کہ کسی سے سوال کریں اور وہ جواب نہ دے۔ بگڑ کھڑے ہوئے "قسم خدا پاک کی بس اسوقت لاش پھڑکتی ہوتی واللہ لاش پھڑکتی ہوتی۔ ہونھ خواجہ بدیع کو کیا وہ سمجھے ہیں۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ تماشا دکھا دیتا"۔

انھوں نے جو اسقدر وحشت کی لی تو وہ بیچارہ سمجھا کہ یہ پاگل ہے اگر بولوں تو خدا جانے کاٹ کھائے چپلت دے۔ چوٹ کرے۔ کر پڑے اس سے بہتر یہی ہے کہ

چپکے ہو رہو۔ اسکے سکوت سے میاں خوجی سمجھے کہ دب نکلا اور بھی اکڑ گئے۔ اسنے جو اس دیوانے کو اکڑتے دیکھا تو سمجھا کہ اب چوٹ کیا ہی چاہتا ہے۔ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ پیچھے ہٹنا تھا کہ میاں خوجی اور بھی شیر ہو گئے مگر گنڈے تول تول کے رہجاتے تھے۔ پوچھا "بھلا ٹھنڈا پانی بھی یہاں مل سکتا ہے مگر اسقدر سرد ہو کہ دانتوں میں لگے" وہ جھٹ پٹ آب سرد لایا۔ خوجی نے پیا تو آب حیات کا مزہ پایا" پانی ہے کہ آب زندگانی ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے"

اللہ اللہ۔ اب میاں خوجی اپنے وقت کے بادشاہ ہو گئے۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔ اُف ری تیری سخاوت اُس آدمی کو اور بھی یقین ہو گیا کہ اس شخص کو خلل دماغ ضرور ہے۔ اس سے مانگوں تو کیا مانگوں۔ اسکے پلے ٹکا تو ہے نہیں۔

خوجی نے پھر اکڑ کر کہا "مانگ کچھ۔ جو کچھ چاہے سو مانگ"

پھر اُس شخص سے پوچھا کہ "تم یہاں کب سے ہو۔ کیا کام کرتے ہو۔ نام کیا ہے۔ باشندے کس صوبہ کے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "میں یہاں ہوٹل میں نوکر ہوں۔ میرا نام تہور خاں امروہے کا رہنے والا ہوں"

"اخاہ۔ یہ امروہہ۔ یہی امروہہ نہ"

"یہ کون"

خوجی جھلا کر بولے "اجی یہی لاحول۔ مراد باد کے پاس جو ہے"

"جی ہاں"

"یہاں کب سے ہو"

"ابی سینیا کی لڑائی کے وقت سے"

"بھلا اس ہوٹل میں مسلمان لوگ کیا کرتے ہیں"

"برابر کیوں"

"ہم تو نہ کھائیں"

"پہلے میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی پاگل ہیں مگر اب تشفی ہوئی"

خوجی نے وہ وہ مجنونانہ حرکتیں کیں کہ ہوٹل والوں کو دل لگی ہاتھ آئی دو ایک دل لگی بازوں نے سوٹ کی کہ خوجی کو چھیڑنا چاہیئے۔ اس ہوٹل میں ایک شخص اس کام پر مقرر تھا کہ پنکھا قلیوں کی نگرانی کرے۔ یہ شخص بونا تھا۔ خاص قاہرہ کا رہنے والا۔ لوگ سوچے کہ اس بونے سے اور خوجی سے پکڑ ہو۔ تو خوب بات ہے۔ لوگوں نے اس بونے سے جا کر کہا کہ چلو تمھاری کشتی بدی گئی۔ بونا میاں خوجی کے قریب آیا اور جھک کر سلام کیا۔ خوجی نے جو دیکھا کہ ایک شخص ہم سے بھی اونچے ہیں تو اکڑ کر اور اینڈ کر آنکھوں سے سلام کا جواب دیا بونے نے ایک دفعہ ہی موقع جو پایا تو میاں خوجی کی ٹوپی اتار کر چٹاخ سے ایک دھول جمائی اور ٹوپی پھینک کر بھاگا۔ مگر ذرا ذرا سے پاؤں بھاگ کے جاتا کہاں خوجی بھی جھپٹے آگے آگے بونا اور پیچھے پیچھے میاں خوجی" او گیدی او مردک نہوئی قرولی واللہ۔ اسدم بھونک ہی دیتا پنج سے قرولی بھونک دیتا" تھوڑی دیر میں خوجی نے بونے کو پکڑ لیا اسکے سر پر ایک دھپ جڑی تڑ سے پڑی اور چٹاخ کی آواز گونجنے لگی۔ پھر ایک اور جمائی اور بولے" او گیدی دے ماروں اٹھا کر" اور جھلا کر بونے کو اٹھا کے دے مارا۔ چاروں شانے چت۔ اور اکڑ کر بولے "وہ مارا۔ اور لے گا"

تھوڑی دیر کے بعد میاں آزاد واپس آ گئے تو خوجی بولے" اس وقت ایک کشتی اور نکالی"

"کشتی کیسی؟"

"کشتی کیسی کیا معنے۔ کیسی ہوتی ہے کشتی"

"معلوم ہوتا ہے پٹے ہو"

"اُس پٹنے والے کی ایسی تیسی اور کہنے والے کو کیا کہوں"

خوجی نے تہور خاں کی طرف دیکھ کر کہا "ارے میاں بولتے نہیں"

تہور خاں نے کہا "حضور یہ سچ کہتے ہیں۔ ایک بونا ہے اس کو کئی چپتیں لگائیں اور اُٹھا کر دے پٹخا"

خوجی بولے "وہ پٹخنی بتائی کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا۔ دو ہفتہ تک کھٹیا سے نہ اُٹھ سکے گا۔

اب سُنئے کہ آزاد ایک مہ لقا میڈا نامی سے پھنس گئے۔ اور روسی جاسوس کے شبہے میں قید کر کے قسطنطنیہ بھیج دیے گئے۔ خوجی عرصہ تک اسکندریہ میں پڑے رہے۔ بالآخر کونسل کی مدد سے قسطنطنیہ جب پہونچے کہ آزاد رہا ہو چکے تھے آزاد قسطنطنیہ کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے اور خوجی بھی وہاں جا پہونچے۔ دونوں نے اپنی اپنی داستان سُنائی۔ خوجی کو معلوم ہوا کہ آزاد نے میڈا سے شادی کرنے کو جو انکار کیا تو اس نے رپورٹ کر کے جاسوسی میں پکڑوا دیا تو بولے "سُنا میاں ہم تمہارا بدلا لیں گے کُل اُمور اور اُمور کی تہ سمجھ گئے ہیں۔ یہ اس جہوش کا کام نہیں یہ کسی نے درغدان دیا ہے مطلب یہ کہ کسی کی سکھائی پڑھائی تھی مگر اس مردود سے انشاء اللہ ہم کھرے کھرے بدلا لیں گے۔ اُخوہ اتنے دن قید خانہ میں بھی رہے افسوس صد افسوس بڑا رنج ہوا۔ اسوقت واللہ کمال افسوس ہوا۔

آزاد نے کہا "چلئے اب افسوس نہ کیجئے مضیٰ ما مضیٰ"

خوجی نے کہا "ہم خوب بن ٹھن کے بیٹھتے ہیں شام کو ہمیں ان کے پاس لے چلئے دیکھتے ہی عاشق نہ ہو جائے تو سہی مگر اُستاد شرط یہ ہے کہ قرولی ہمارے پاس ضرور ہو ورنہ بے قرولی کے ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔

"کیا لڑیے گا"

"نہیں صاحب لڑنا کیسا۔ بے قرولی کے جوبن نہیں ہم تو او بچی بن کے جانا چاہتے ہیں نہ۔ آپ یہ باتیں کیا جانیں"

اتفاق سے میڈا ابھی انا البرق کہتی ہوئی تشریف لائیں۔ آزاد نے کہا "لو وہ خود آ گئیں"

"ارے غضب ہو گیا"

"یہ کیوں"

"اجی اپنے ٹھکنے ہوتے تو دیکھتی"

حضرت نے وحشت میں آ نکر ہوٹل کی ایک میز کا کپڑا اوڑھ لیا اور تولیا سر میں باندھا اور ایک چھری ہاتھ میں لیکر اکڑ فوں بن کے کھڑے ہوئے" آزاد نے استادہ ہو کر میڈا سے مصافحہ کیا۔ میڈا کا جوبن دیکھ کر خوجی ہزار جان سے عاشق ہو گئے اور بڑے غور سے گھورا کیے۔ آزاد سے کہنے لگے "قسم خدا کی وہ جھمکڑا ہے کہ دیدنہ شنید"

میڈا نے جو انپر نظر ڈالی تو عجیب الخلقت آدمی دیکھ مسکرا دی۔ خوجی از بس محظوظ ہوئے۔

"کیوں میاں آزاد سچ کہنا۔ اینجانب کے دیکھتے ہی کھل گئیں نہ واہ رے ہم جو عورت دیکھتی ہے گھنٹوں گھورا کرتی ہے جوانی کی امنگ اور حسن گلو سوز بھی کیا چیز ہے"

میڈا نے آزاد سے پوچھا "یہ کون شخص ہے"

آزاد نے کہا "یہ ایک پاگل ہے۔ اسکو یہ خبط ہے کہ جو عورت مجھے دیکھتی ہے ریجھ جاتی ہے۔ تم اس کو بناؤ اسوقت"

میئنڈا شوخ تو تھی ہی اتنی شہ پاتے ہی خوجی کو خوب بنایا۔ اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ حضرت ریشہ خطمی ہوگئے مسکراتے ہوئے گئے اور قریب جاکر کرسی پر جا ڈٹے۔

میئنڈا نے ہاتھ میں ہاتھ دیکر کہا "آپ کا نام کیا ہے"

خوجی نے آزاد سے کہا "سمجھاتے چلو جی"

آزاد نے سمجھانا شروع کیا۔ جو یہ کہتی تھی۔ ان کو سمجھاتے تھے اور وہ جو کچھ کہتے تھے ان کو۔

خوجی نے کہا "آپ کی ملاقات سے بہت خوش ہوا۔

میئنڈا نے مسکرا کر کہا "کل آپ کی دعوت ہے"

آپ شراب پیتے ہیں"

"ہاں۔ نہیں۔ مگر۔ اچھا۔ نہیں۔ نہیں"

آزاد جھلا کر بولے "مرد آدمی ایک بات کہو تو میں سمجھاؤں یہ نہیں اور ہاں اور مگر اور اچھا کیا معنے"

خوجی نے کہا "کہو افیم پیتا ہوں"

آزاد نے جب یہ کہا تو میئنڈا بولی "یہ آپ کا گلاب سا چہرہ کمھلا جائے گا۔ افیم نہ پینا چاہیئے۔ شراب پیو گے"

میئنڈا نے خوجی کا ہاتھ چوم لیا۔ اللہ اللہ اب کیا پوچھنا ہے۔ اب تو دماغ عرش بریں پر ہے۔ مزاج ہی نہیں ملتا۔ کھلے جاتے ہیں۔ اکڑے اور آزاد کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا "کیوں استاد۔ سچ کہنا ہم کیسے جوان رعنا ہیں۔ اور تیسرا ابھی بنے ٹھنے نہیں ورنہ سیکڑوں بار ہاتھ چوم لیتی۔ واہ رے ہم۔

میئنڈا نے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے"

آزاد نے اردو میں کہا "ان کا نام خوجی"

خوجی بگڑ گئے اور بولے "کس مردود کا نام خوجی ہے۔ حضور مجھے لوگ جناب خواجہ بدیع صاحب کہتے ہیں"

"اہو ہو کیا پیارا نام ہے"

خوجی نے زمین دوز ہو کر سلام کیا اور آزاد سے بولے "کیوں کتنی تعریف کی ہے نام کی نہ کہو گے۔ اور خوجی جو کہتے تو نظروں سے گر جاتے"

میڈا نے پھر پوچھا "آپ کچھ تھوڑا تھوڑا گانا بھی جانتے ہیں"

آزاد نے کہا "انکار نہ کرنا۔ کہو ہاں جانتا ہوں ضرور"

خوجی بولے "ہاں اور ناچنا بھی جانتا ہوں"

میڈا "اہو ہو ہو۔ تو پھر ناچو"

خوجی نے ناچنا شروع کیا۔ میڈا اور آزاد کی یہ کیفیت کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ میڈا تھوڑی دیر میں ہوٹل سے گئیں تو میاں خوجی کے دماغ عرش بریں پر تھے۔ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے تھے۔ میاں آزاد نے کہا "خواجہ صاحب ذرا ادھر تشریف لائیے" فرمایا "ہشت" پھر آزاد نے کہا "قبلہ ذرا اس طرف مخاطب ہو جیئے" آپ نے کہا "وحشت"

آزاد نے صلاح دی "اب ایک کام کیجئے کہ خوب بن ٹھن کے جائیے خوب نکھر کر جسمیں وہ بھی کھلجائیں کہ ہاں ایسا جوان دیکھا"

خوجی بولے "ہوں شانِ خدا آپ اور ہم کو سکھائیں"

تھوڑی دیر میں میڈا کا خط آیا۔ خوجی نے خط کو تین بار چوما اور میاں آزاد کو دیدیا۔ آزاد نے پڑھا تو یوں لکھا تھا "میرے پیارے جوان تمھاری ایک ایک ادا نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے۔ تمھارا سرو قد اور تمھاری سارس کی سی گردن اور بیل کے سے گول گول دیدے اور بندر کی سی حرکتیں

جب یاد آتی ہے تو میں اُچھل اُچھل پڑتی ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ آج کس وقت آؤ گے۔ ایسا نہ ہو کہ نہ آؤ۔ تمھیں اُسی کی قسم جسکو تم سب سے زیادہ چاہتے ہو کہ اس خط کو گن گن کر سَو بار چوم لینا۔ اور وعدہ پر آنا ضرور آنا "

میاں آزاد نے یہ خط پڑھ کر خواجہ بدیع صاحب کو سُنایا تو از بس مسرور ہوئے۔ خواجہ بدیع کو شک کی جگہ یقین بلکہ یہی ایمان و دین تھا کہ میڈا ان کی ہی پر جان جاتی ہے۔ آزاد اور بھی پر چک دیتے جاتے تھے "

آزاد بولے " یار اب تمھارے ساتھ نہ رہیں گے "

" وجہ ؟ "

" غضب خدا کا میڈا اسی ماہ رو اور ہمارے سامنے تمھارا عشق ظاہر کرے "

خوجی کھلکھلا کر ہنس پڑے " ہا ہا ہا۔ اب سمجھے۔ ہم جوان ہی ایسے ہیں اسکو کوئی کیا کرے لیکن تم اگر خلاف ہو گئے تو واللہ میں میڈا سے بات تک نہ کروں۔ مجھ کو جان تک سے زیادہ تم عزیز ہو۔ قسم خدا کی اب دنیا میں تمھارے سوا اور کوئی میرا مربی اور سرپرست نہیں ہے اور ہم تو اب بوڑھے ہوئے۔ یہ بھی اس پری چہرہ کی عنایت ہے کہ ہم پر اور یہ کرم۔ مگر ہاں اسمیں شک نہیں کہ ہم کلّے ٹھلّے کے گبھرو جوان ہیں "

خوجی نے آزاد سے پوچھا " کیوں میاں بھلا فارسی میں خط لکھیں تو کیسا۔

آزاد نے کہا " فارسی یہاں کون جانے بھلا

سمجھ جائیں۔ خوجی نے میڈا کے نام خط کا جواب اس طرح پر بھیجا " عزیز از جان بسعادت نشان نور چشمی روشن لقا میڈا کو بعد سلام و نیاز کے گلدستوں کے یہ واضح ہو جائے کہ تمھارا نیاز نامہ مورخہ تاریخ آج کا واسطے اسکے کہ میں آؤنگا یا نہیں بیان کر دوں میں نے پایا۔ مژدۂ پیغام لایا سد تر سے گدا کے مشام جان میں طرح کی بو بھی نہیں گئی ہے × خبر لی ہے تو تمہیں سے

دامن پہ گرد چھو بھی نہیں گئی ہے۔ خط میں نے بغور پڑھا۔ فائدہ بخشا۔ اچھا لکھا ہے۔ بقول صفدر ستم سہتے ہیں نیمجاں کیسے کیسے + وہ لیتے ہیں اور امتحاں کیسے کیسے۔ میں وقت مقررہ کے پہلے آؤنگا۔ تم پر جان دیتا ہوں ہر روز صبح اُٹھ کر نام لیتا ہوں۔ برسوں کا عاشق ہوں۔ مدتیں ہوگئیں کہ غم سے دل دوچار ہے۔ تیر پار ہے۔ آرزو دار اور تمنا مند ہوں کہ از راہ کرم مہربانی کر کے اجازت دیجائے کہ آج ہی ساچق لیکر آؤں ڈھول اور نقارہ اور گڑگڑ جھبڑ جھبڑ کی صدا بلند ہو۔ پھر کیا پوچھنا ہے بڑی دل لگی ہو واللہ اگر اجازت دو تو دولھا بن کر آؤں اور تم کو بیاہ لے جاؤں مگر شرط یہ کہ بعد خرچ کرنے کے اس قدر رقم کے میں مطلب کو اپنے پہونچوں۔ آگے جو رائے ہو بندہ رائے کا ہوں۔ بندہ صلاح کا ہوں اور باقی کچھ نہیں سہ
لیا جو ایک دل اس نے تو دو دو لے بوسے + ہزار شکر یہ سودا بہت گران نہ رہا"

خواجہ صاحب نے یہ خط لکھ کر مینڈھا کے آدمی کو دیا اور اکڑ کر آزاد سے کہا "کیوں قبلہ کہئے۔ اب بولئے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ بس ایک ہم ہی ٹبڑے خوبرو جوان ہیں۔ اجی فضلنا بعضکم علی بعض۔ اس نے بھی دیکھا کہ سرخ و سفید اور رنگین مزاج اور شگفتہ جبیں آدمی ہے بشرے سے بانکپن برستا ہے اب اسکو چھوڑ کے کس کے ساتھ شادی کروں چلئے تڑ سے خط لکھ بھیجا"

آزاد نے کہا "اس میں کیا فرق ہے۔ آپ ایک جوان رعنا اور زیبا اندام ہیں بھلا آپ پر کیونکر نہ ریجھتی۔ اور آپ پر نہ ریجھتی تو پھر کس پر ریجھتی مگر خط تو گھٹو الو میاں خلیفہ کو بلاؤ۔" خوجی نے فوراً حکم دیا "جاؤ ایک آدمی حجام کو بلالاؤ" حجام آیا خط بننے لگا۔ خوجی گال پر ہاتھ رکھ کر کہتے جاتے ہیں "ابھی گھوٹے جاؤ۔ ابھی کھونٹی باقی ہے۔ خوب گھوٹو" الغرض چار ابرو کا صفایا ہو گیا۔ آزاد نے کہا آپ اسوقت انتہا کے

حسین معلوم ہوتے ہیں"

خوجی بولے "کیوں صاحب سہرے کی تو فکر کیجئے"

"ہاں ہاں گھبراتے کیوں ہو"

"ہاں ہاں خوب۔ یاد آیا آپ ذرا باجے والوں کی تو فکر کیجئے۔ ہاتھی گھوڑا ہاہا اور فانس پالکی جھنڈی برادار۔ چوبدار۔ نوبت والے۔ شہنائی والے کے بغیر شادی کیسی۔ مگر ہمارے لئے جو گھوڑا منگوایئے گا وہ شائستہ ہو۔ گو رسالداری اور کمیدانی کی حالت میں برسوں گھوڑے پر سوار ہوئے ہیں، مگر اب ربط نہیں ہے"

غرض دو گھڑی دن رہے ہوٹل سے خوجی کی برات چلی تین مزدور پھول کے برتن کو لکڑی سے بجاتے جاتے ہیں۔ دو لونڈے آگے پیچھے ساتھ۔ خوجی ایک ہمزادو کی گود میں گیروے کپڑے پہنے ہوئے سر پر سیاہ پگڑی اور سہرا لٹکا ہوا۔ تھوڑی دور جا کر خوجی بولے "ہاہاہا۔ ارے ارے ارے لاحول ولا قوۃ روک لو۔ تاشے والے کہاں ہیں۔ پردیس میں بھی انسان پر کیا مصیبت پڑتی ہے۔ افسوس صد افسوس اب میں دولہا بن کر رہوں یا انتظام کروں۔

اتنے میں ایک جمائی آئی۔ پھر ایک جمائی آئی۔ "ارے اہو ہو افیم پینا بھول گئے مارے خوشی کے یاد ہی نہ رہا کہ افیم بھی نہیں کھائی۔ اب کیا کیا جائے۔

پھر یاد آیا کہ قرولی تو پاس ہے ہی نہیں۔ اُف غضب ہو گیا حکم دیا کہ لوٹا دو برات۔ واپس آئے تو آزاد نے پوچھا "یہ کیوں واپس کیوں آئے بولو بھائی!

خوجی بولے "کیا بولیں میاں سے قیس و فرہاد جو اس عہد میں زندہ ہوتے پیتے دھو دھو کے مرے سنگ لحد کے تعویذ"

"سبحان اللہ شعر تو ایسے حسب حال پڑھ دیتے ہو کہ جی خوش ہو جاتا ہے مگر یہ بتلائیے حضور واپس آنے کی وجہ تو بتاؤ"

" نشان کا ہاتھی تو تھا ہی نہیں "

" بس اسی جہ سے واپس آئے "

قرولی تو پاس تھی ہی نہیں۔

" عجب آدمی ہو بھئی۔ آپ جنگ کے میدان میں جاتے ہیں یا شادی کرنے۔ پھر قرولی سے کیا واسطہ "

" جبھی میں بانکے معلوم ہوں "

اتنے میں مس میڈا بھی آگئی۔ آزاد نے کہا " لو وہ خود ہی یہاں آگئیں۔ خوجی نے جھک کر میڈا کو سلام کیا اور مسکرا کے میڈا نے سلام کا جواب دیا۔ اور " واہ آپ خوب آئے "

آزاد نے خوجی کو میڈا کا مطلب سمجھایا تو بولے۔ کمال خفیف ہوا انتہا کی خفت ہے اسوقت۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب برات آدھی دور نکل گئی تو یاد آیا کہ ہاتھی نہیں ہے۔ پھر دس قدم پہ جمائی آئی۔ یاد آیا کہ افیم نہیں کھائی ہے اور تھوڑی دور چلا تھا کہ قرولی یاد آئی لہذا اثنائے راہ سے واپس آیا۔ اب آپ فرمائیے کیا لائے ہے آپ کی "

میڈا نے کہا " اب اسوقت تو جانے دیجئے کل سمجھا جائے گا۔ چلئے اس کمرے میں ہمیں کچھ کہنا ہے "

خوجی کی باچھیں کھل گئیں۔ میاں آزاد کی طرف بڑے غرور سے دیکھا اور میڈا کے ساتھ کمرے میں گئے۔ میڈا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تڑ سے ایک چپت دی اور پھرتی کے ساتھ کمرے کے باہر تھی۔ خوجی نے ٹوپی اٹھائی اور سوچے کہ بیڈھب سامنا ہے۔ اچھے گھر بیانہ دیا۔ ابھی سے کھوپڑی سہلانے لگیں۔ مگر کچھ مضائقہ نہیں سمجھا جائے گا۔ باہر تشریف لائیے۔

آزاد نے پوچھا کہو کیا

"ایک بوسہ لیا اور تیرا رہ پھرا تو کمرے کے باہر تھی"

"بڑے خوش قسمت ہو"۔

خوجی ایک مونچھ پر تاؤ دے کر بولے" میں ہی. میں نہیں تو یوں ہی"

آزاد نے کہا" اس میں شک نہیں کہ یہ عورت پری ہے۔ حُور جنّت واللہ خود بہشتی مگر میں نے تو پہلے ہی شادی سے انکار کیا تھا"

"اگر آپ نے یہ کلمہ اب دوہرایا تو قرولی بھونک کر خود مر جاؤں گا

اتفاق سے ایک بیجا بات نکل گئی ے چیست ہندو یا مسلماں کوزۂ یک کوزہ گر+

گرچہ کوزہ دو شمار آید ولیکن گل یکیست"

"لے بس اب تمہارا قصور معاف کر دیا۔ ایسا برجستہ شعر تم نے پڑھا یا حسب حال کہ جی خوش ہو گیا۔ جاؤ قصور معاف کیا۔ سلام کرو"

مگر یہ سب دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔ آزاد کو ترکی فوج میں آفیسری مل گئی۔ وہ فوج میں داخل ہوئے اور خوجی بھی اُن کے ہمراہ چلے گئے۔

(۶)

ادھر میدان جنگ میں میاں آزاد مشکی گھوڑے پر سوار فوج روس کی طرف جاتے تھے اُدھر خواجہ بدیع الزماں درخت ہی سے غل مچاتے تھے۔ ترکوں اور روسیوں میں گولا چلنے لگا۔ میاں خوجی درخت کے ایک موٹے ٹھنے پر بیٹھے افیم گھولنے لگے۔ افیم پی کر لیمیٹ گئے اور پینک میں آ گئے۔ ترکوں اور روسیوں میں بہت سختی کے ساتھ مقابلہ ہوتا رہا۔ روسی جیت رہے تھے خواجہ بدیع الزماں صاحب پینک سے چونکہ روسیوں کی یورش اور فوج کے پرے درخت کی شاخ سے دیکھ رہے تھے۔ شام ہوتے ہوتے ترکی فوج تدبیر کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ روسیوں کی ایک

پلٹن نے اس درمیان میں پڑاؤ ڈالا جس کے سامنے پہلے ترکوں کا مورچہ تھا اور جہاں ایک پیڑ پر خوجی موجود تھے۔ ایک روسی اس پیڑ کے پاس آیا اور خوجی سے اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ خوجی اردو میں اس کو پھٹکارتے رہے۔ آخر کار درخت سے نیچے اُترے۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہی جھک جھک کر سلام کرنا شروع کیا۔ روسی فوجیوں نے ان کو بھی ترکی قیدیوں میں شامل کر دیا۔

خوجی ترک سپاہیوں سے باتیں کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ آزاد قید ہو گئے بس فوراً بولے "ہائے ہائے آزاد۔ تیری جوانی پر افسوس آتا ہے"

ایک ترک نے جو اپنی بات انھیں سمجھا سکتا تھا اور اپنی سمجھ سکتا تھا ان سے پوچھا "تم ان کے نوکر ہو"

خوجی نے جواب دیا "میرا لڑکا ہے جی۔ تم نوکر بنائے دیتے ہو خیر! ع
اگر پدر نتواند پسر تمام کند میں نے بھی رسالداریاں کمیدانیاں کیں مگر آزاد نے مجھ سے بڑھ بڑھ کے کام کئے"

ترکی اس فقرے کو اچھی طرح نہیں سمجھے مگر آزاد پاشا کا باپ سمجھ کر فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹوپی اُتار دی اور جھک جھک کر سلام کیا خوجی بھی رونے لگے اور کہا "بھائی مجھے تو بوڑھوتی وقت قتل کر گئے آزاد پاشا ہائے برادرمن از چہ گویم کہ ایں سانحۂ ناگفتنی و برداشت کردنی چہ شود مگر قادرِ ذوالجلال ماراو سانحۂ مارا و پسر دلبندم را از ضرر نگہدارد۔ بگو آمین بگو آمین تم آمین خاصے"

ایک روز روس کے ایک میجر نے انکی انوکھی قطع اور نرالی وضع اور ناٹے ماٹے بھر کے ہاتھ پاؤں جو دیکھے تو جی چاہا کہ ان سے باتیں کرے ایک ترکی کو جو فارسی داں تھا مقرر کر کے خواجہ بدیع الزماں صاحب سے باتیں ہونے لگیں۔

میجر نے پوچھا آپ بھی کبھی لڑائی میں شریک ہوئے تھے؟

خوجی آگ ہو گئے جھلا کر جواب دیا" واہ فوج کے افسر اور ایسے کوڑھ مغز آج ہی دیکھنے میں آئے۔ ہمارا کینڈا ہی گواہی دیتا ہے جی کہ ہم فوج کے جوان ہیں۔ کینڈے سے نہیں پہچانتے"

اس کا ترجمہ کیا گیا تو روسی میجر نے کہا" معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو خلل دماغ ہے" مگر پھر پوچھا" آپ لوگ گولی چلا سکتے ہیں۔ نشانہ کبھی لگایا ہے خوجی نے جواب میں کہا" اجی حضرت اب فصد کھلوائیے۔ گولی چلائی یا نہیں چلائی مگر سامنے ہو جائے تو توبہ ہی بھلی ہے ایک مرتبہ ایک کتے سے اور ہم سے لاگ ڈانٹ ہو گئی۔ خدا کی قسم ہم سے گیارہ بارہ قدم کے فاصلے پر کتا کھڑا تھا۔ دھر کے داغتا ہوں تو پوں پوں کرتا ہوا کتا بھاگ کھڑا ہوا"

میجر خوب ہنسا۔ خوجی نے مونچھوں پر تاؤ دیے میجر نے حکم دیا کہ ایک دونالی بندوق لاؤ تب۔ تو خوجی صاحب چکرائے سوچے کہ سات پیڑھیوں تک کسی نے بندوق چلائی نہ تھی ہم کو تو یاد ہی نہیں آتا کہ بندوق کبھی عمر بھر چھوئی بھی ہو۔ اتنا تو جانتے ہیں کہ بندوق میں گز ہوتا ہے اور قرابین میں گز نہیں ہوتا اور تپنچہ بندوق سے بڑا ہوتا ہے۔ بندوق انکے سامنے رکھی گئی تو چھوتے نہیں مترجم سے کہنے لگے" بابائے ما شنو بین مثل زنبیل عمر عیار ہستم کہ ہم دافی اور گولی وا نگیدن اُستاد جنگ کردم بے بدل من دانم کہ گولی را چلادم یعنی بچلادم بس"

میجر خواجہ صاحب کے تمسخر سے اسقدر خوش ہوا کہ پہرے والوں کو حکم دیدیا کہ ان پر سختی نہ کرنا شب کو خواجہ بدیع سوچے کہ اب بھاگنے کی تدبیر ضرور سوچنی چاہیئے۔ دو بجے کے قریب خوجی نے افیم گھولی اور چسکی لگائی۔ تہ پر تہ جمائی۔ اتفاق سے ان کی نظر ایک ٹٹو پر پڑی۔ چپکے سے اُٹھے اور بغور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ قریب جا کر اس ٹٹو پر سوار ہو کر چلے۔ بدن کانپ رہا تھا جب کوئی سو قدم کے

فاصلے پر نکل گئے تو جان میں جان آئی۔

تھوڑی ہی رات باقی رہی تھی کہ انھوں نے پہاڑ کے قریب دو فوجیں آمنے سامنے دیکھیں۔ یا الٰہی ترکی اس میں کون ہیں اور روسی کون۔ تخ تخ کرتے ہوئے فوج کی طرف چلے۔ قریب جا کر غل مچایا "آن پہونچے آن پہونچے خواجہ بدیع آن پہونچے۔ واللہ دو کروڑ روسیوں سے بچ کر آ گئے" لشکر میں آئے تو دیکھا روسی ہی روسی نظر آتے ہیں لگے سر پیٹنے "ارے ہائے غضب"

کئی آدمیوں نے خوجی کی تلاشی لی۔ اب خوجی اور سب اسباب دکھاتے ہیں مگر افیم کی ڈبیا نہیں کھولنے دیتے جھلا کر کہتے ہیں "او گیدی ماروں گا بندوق دھواں اُسپار ہو جائے گا" صبح کے وقت خواجہ صاحب کے اظہار لیے گئے۔ روسی افسروں نے باہم مشورہ کیا اس پاگل افیمی کو قید کرنا مقتضائے بسالت نہیں ہے خواجہ صاحب کو روسیوں نے رہا کر دیا تو اڑے کہ ہم کو یابو دلے۔ بڑی دیر کے بعد یابو ان کے حوالے کیا گیا۔ یابو پر سوار ہوئے اور چلے۔ چلتے چلتے آخر ترکوں کے ایک دستہ میں جا ملے۔

ترکی فوج میں خوجی کو معلوم ہوا کہ میاں آزاد کو پولینڈ کی شہزادی نے قید کر رکھا۔ خوجی ترکیبیں لڑا لڑا کر اس شہزادی کی خدمت میں پہونچ ہی گئے اور اس سے اجازت حاصل کر کے میاں آزاد سے قید خانہ میں ملنے پہونچے۔ قید خانہ کا دروازہ کھولا اندر گئے۔ پہلے میاں آزاد سمجھے کہ پولینڈ کی شہزادی نے کسی کو بھیجا ہے کہ ایک بار پھر ہم کو سمجھائے اور راہ راست پر لائے مگر دل میں ٹھنی تھی کہ شادی یہ ہرگز راضی نہ ہونگا چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ خوجی قریب پہونچے مگر تاریکی کے سبب سے آزاد نظر نہ آئے۔ تو جھلا کر کہا او گیدی بھونک کہ دوں قرولی۔ آزاد نے یہ آواز سنتے ہی اُٹھ کر

خوجی کو گود میں اُٹھا لیا اور کودنے لگے۔ خوجی بوکھلاہٹ میں کہتے رہے "ہا آزاد
آزاد ہونہہ۔ ایں۔ الٰہی خیر کیسی دل لگی باز نے دل لگی تو نہیں کی۔ ارے میاں
تم کون ہو۔ بھائی جان تم بھوت ہو یا پریت۔ ہم کو چھوڑ دو میرا ابھارئی۔ ارے یار
میں اپنے آزاد کی کمک کو جاتا ہوں مجھے چاہے پکڑ لو مگر کوئی تدبیر ایسی کرو کہ وہ بچ جائے"

اس فقرے پر آزاد کا دل بھر آیا۔ "بھائی خواجہ صاحب میں بھوت...."
خوجی کو تاب کہاں کہ پورا فقرہ سنیں۔ ایسے خوش ہوئے کہ جامے میں پھولے
نہ سمائے۔ آزاد نے کہا "یار آہستہ آہستہ گفتگو کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آجائے
پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں تک کیونکر پہونچے"

"ہم تو سب بتائیں گے تم یہ بتاؤ کہ قید خانہ نصیب کیوں ہوا۔ چور نہیں
ہو ڈاکو نہیں ہو جعلساز نہیں ہو۔ پھر یہ کیا ہوا۔ تم اور قید خانہ۔ اور یہ بھی ظاہر
ہے کہ فوجی قیدی نہیں ہو پھر کیا"

"کیا بتائیں بھائی۔ یہاں ایک پری رہتی ہے۔ دیکھو تو غش آجائے بیہوش
ہو جاؤ۔ اسی کے ہاتھوں ہم اس مصیبت میں مبتلا ہوئے"

"کیا کچھ بے ادبی کر بیٹھے تھے وہ صاف صاف بیان کرو"

"اجی خدا جانے کیا ہوا تھا۔ مگر خیر جو ہوا وہ ہوا۔ اب یہ بتاؤ کہیں بھاگنے
کی بھی راہ ہے۔ کوئی تدبیر ایسی بھی ہے جس سے بچ نکلیں"

"ہاں ایسی بھی ایک تدبیر ہے۔ مگر مانو گے یا نہیں"

"ہم اور نہ مانیں۔ ہم تو خدا سے دعا مانگتے ہیں"

"کمبخت اتنی عقل نہیں کہ سنتری پہروں میں سے کس طرح بھاگو گے"

"تو اب حسن آرا کو نہ دیکھ سکیں گے"

"پھر خود کہہ رہے ہو لاعلاج۔ ابھی پری لاؤ پھر ہم لے اور تم انکار کرو۔ شومی

طالع - اس کو کوئی کیا کرے - افسوس خدا کی قسم - تم کو لازم تھا کہ فوراً نکاح کر لیتے اور خوب لطف اُٹھاتے - اگر دلبستگی ہوتی تو سبحان اللہ سبحان اللہ ورنہ اس حالت میں بھاگنا کیسی آسان ہوتا - آج صبح جب میں سلام کے لیے گیا تو دیکھا مسکرا رہی ہے - ہائے وہ مسکرانا عمر بھر نہ بھولے گا - کیا ادا تھی سبحان اللہ سبحان اللہ - ایسی پری زاد نوخیز پا کر انکار کرنا عقل کے خلاف ہے یا نہیں - فوراً منظور کر لو - ایسی پری آدم زاد کو قسمتوں سے ملتی ہیں"

"مگر حسن آرا سے قول ہارے"

"واللہ نرے گاؤدی ہو - ارے میاں - اب تو جان کے لالے پڑے ہیں اب تو اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ جس طرح ممکن ہو اس پری زاد کو خوش کرو تم کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ تم کسی طور پر اس کو چھوڑ کے جاؤ ہی گے نہیں کہو کہ میری جان جاتی ہے جب کہیں تمھارا اعتبار ہوگا - اپنی ناتجربہ کاری کی بدولت تم نے یہ دن دیکھا"

"ہو سٹری تو کیا ہوا - مگر بات ٹھکانے کی کہتے ہو - مگر اب اقرار یہ کون کرے"

"آخر لونڈے ہونا ہم آئے کاہے کے لیے - ہم کو بھیجا کیوں ہے"

الغرض خوجی پھر شہزادی کے یہاں واپس گئے - یہ طے پایا کہ آزاد اور شہزادی کی شادی ہو - خوجی نے رائے دی "سنئے حضور - آپ اس ملک کی شہزادی ہیں تو ہمارے ملک کے رسوم کے بموجب تزک اور احتشام وہ جاہ تجمل کے ساتھ برات ہو - روشن چوکی ہو - خیز ران دم گھوڑے ہوں - مست ہاتھی ہوں - انگریزی باجا بجے اور برات ٹھاٹھ سے سجے - ورنہ بندہ شریک صحبت نہ ہوگا - شہزادی کو بھی مذاق سوجھا تو برات کے سجانے کا حکم دیدیا - خوجی کے سپرد انتظام تھا - آزاد کو دولھا بنا کر بڑے جلوس کے ساتھ شہزادی کے محل میں لا بٹھایا - شہزادی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی - خوجی کو سخت تعجب ہوا کہ یہ عجب

قطع کی دولہن منھ کھولے ہوئے بے حجاب دولہا سے باتیں کر رہی ہے۔
خوجی نے فارسی میں کہا" برادر بجان برابرم بلکہ از جان بہترم من ایں میگویم
کہ ایں دلھن عجب قاعدہ دارد کہ دہان روشن خود کشودہ بے نقاب پیش نامحرم
و اغیار نظر غلط انداز میدہد۔ ایں قاعدہ دلھن نیست۔ فہمیدی"
آزاد نے کہا" واسطے خدا کے اردو میں گفتگو کیجئے۔ آپ اپنے ملک
دلھن اور اس ملک کی دلھن کا مقابلہ نہ کیجئے۔ ہر ملکے و ہر رسمے"
الغرض آزاد اور خوجی اس شہزادی کے یہاں عرصہ تک رہے اور جب
اسکو ان پر پورا اعتبار ہوگیا تو ایک دن بھاگ نکلے اور ترک کی فوج میں آ ملے۔
آزاد نے ترک کی فوج کے ساتھ بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ ترک کی سرکار سے تمغے
اور انعامات حاصل کیے قسطنطنیہ میں سلطان المعظم ان کے ساتھ اس اعزاز و
ملاطفت سے پیش آئے کہ تمام پاشاؤں کو انسے رشک و حسد ہوا۔ آخر کار آزاد
کو روم چھوڑنا ہی پڑا اور انھوں نے عزم سفر ہندوستان مصمم کر دیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۷۷ء
کو مع خواجہ بدیع جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہندوستان ہوئے۔

(۷)

میاں آزاد المظفر نامی جہاز پر سوار ہوئے۔ مسخروں کے روح رواں
خواجہ بدیع الزماں مس کلیریسا اور مس میڈا ہمراہ ساتھ تھیں۔
خیر خدا خدا کر کے مع المظفر داخل سوئز ہوا۔ اسکندریہ میں آزاد پاشا
مس میڈا کے اصرار سے ایک ہفتہ تک مقیم رہے جس ہوٹل میں پہلے فروکش
ہوئے تھے وہیں اب بھی ٹکے۔ خواجہ بدیع الزماں اکڑتے ہوئے ان کے پاس
آئے اور کہا" آزاد اب یہاں ذرا ہمارے ٹھاٹھ دیکھیےگا چلے تو لوگوں سے

دریافت کرلو کہ ہم نے کشتی نکالی تھی یا نہیں۔ مارا چاروں شانے چیت۔ اُٹھا اُٹھا کے
دے دے مارا۔ اٹھایا اور دے پٹکا اور کس کو۔ اُس پہلوان کو جو تمام مصر میں فرد
تھا جس کا نام لے کر مصر کے پہلوانوں کے اُستاد کان پکڑتے تھے۔ میاں سچ ہی تو
ہے۔ اور اس کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں کسی کا بدن چور ہوتا ہے اس کا قد
چور ہے پہلے تو مجھے ریلتا ہوا اکھاڑے کے باہر لے گیا۔ اور میں بھی چپ چاپ
چلا گیا۔ بس بھائی پھر تو میں نے قدم جما کے جو ریلا دیا تو بول گیا۔ اب پچیتی ہونے
لگی تو بڑے بڑے جوڑوں میں پچیتی کم ہوتی ہے۔ مگر وہ استاد میں جگت اُستاد
اُس نے پیچ کیا میں نے توڑ کیا۔ وہ پشت پر آیا میں نے بُتا بتایا۔ اُس نے دستی
کھینچی میں بغلی ڈویا۔ اُس نے ڈنڈا لگایا میں نے اچک کے کاٹ کھایا"

آزاد نے کہا "بھائی جان سنو۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی سند نہیں ہے جب جانیں
کہ ہمارے سامنے پنجتی دو اور پہلے پہلوان کو بھی دیکھ لیں کہ کیسا ہے"

اتنے میں ہوٹل کے آدمیوں نے بونے کو لاکر سامنے کھڑا کر دیا۔ بونا منہ
چھپانے لگا۔ خواجہ صاحب بگڑ کھڑے ہوئے۔ آزاد کی طرف اشارہ کیا اور
کہا کہ یہی پہلوان ہے جس کی کشتی ہم نے نکالی تھی آزاد بہت ہنسے کہا "بس
ٹائیں ٹائیں فش۔ بونے سے کشتی نکالی تو کیا کسی برابر والے سے کشتی نکالتے
تو جانتے اسی پر اسقدر ناز تھا۔ یا الٰہی کان سنتے سنتے تھک گئے۔ یہاں جو
آن کے دیکھتے ہیں تو وہی ڈھاک کے تین پات لاحول ولا قوۃ"

خواجہ صاحب نے گردن ہلا کر کہا "کہنے اور کرنے میں فرق ہے جناب
اگر حضور اس سے ہاتھ پاؤں ملائیں تو ظاہر ہو جائے کہ لوہے کے ہاتھ پاؤں
ہیں اور میرے ہاتھ پاؤں فولاد کے ہیں آپ کی نرم نرم انگلیاں اور نازک
کلائیاں دکھنے لگیں گی"

بوناخم ٹھونک کر سامنے آن کھڑا ہوا اور خواجہ صاحب پینترے بدل کے پہنچے "آؤ چیڈا گلنجیرو آج بھی گدّا دوں گا"

اب سنئے کہ ادھر خواجہ صاحب اُدھر بونا پہلوان دونوں کُندے تُول تُول کے رہ جاتے تھے۔ خواجہ صاحب نے کھسیانا تانا۔ بونے نے منھ چڑھایا یہ جھپٹے اس نے گدّا مارنے کا قصد کیا۔ خوجی نے جھکا کر چپت جمائی بونے نے دھول لگائی اور لُطف یہ کہ دونوں کی چاند گھٹی گھٹائی چکنی اس زور کی آواز آتی تھی کہ سننے والوں اور دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جاتا تھا۔

خوجی بولے "دیکھئے تو دم کے دم میں بیدم کیے دیتا ہوں کہ نہیں"

آزاد بولے "مگر یار اس کا قد تو بہت ہی پست ہے"

"ہائے افسوس" خوجی نے جواب دیا "بھئی تم ابھی بالکل ناتجربہ کار ہو واللہ جو ذرا بھی تجربہ ہو تو بس اور تو کیا کہوں ارے کمبخت اس کا قد چھوٹا ہے جس طرح میرا بدن چوڑا ہے۔ یوں دیکھنے میں تو کچھ نہیں معلوم ہوتا مگر اکھاڑے میں چڑھ اور لنگوٹ باندھ کے کھڑا ہوں پھر دیکھئے بدن کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ تہ بہ تہ بالکل گینڈا بنا ہوا کوئی کہتا ہے دُم کٹا بھینسا ہے۔ کوئی کہتا ہے ہاتھی کا پاٹھا ہے۔ کوئی کہتا ہے ناگوری بیل ہے۔ کوئی کہتا ہے جمنا پاری بکرا ہے اور میں ادھر اُدھر شانے کو دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ کوئی دو چانٹے بھی مارے تو کچھ پرواہ نہیں۔ تو وجہ کیا وجہ یہ کہ مستغنی ہوں یہ جانتا ہوں کہ کوئی بولا اور میں نے اٹھا کے دے مارا۔ ذرا غصّہ آیا انجر پنجر الگ کر دیئے بھئی طاقت کا بھی کیا کہنا۔

خواجہ صاحب نے کئی بار جھلّا جھلّا کر چپتیں لگائیں۔ ایک بار اتفاق سے اس کے ہاتھ میں ان کی گردن آگئی اور اس زور سے گردن پکڑی کہ خواجہ صاحب سے چھڑائے نہ چھوٹی۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے بہت کچھ زور لگائے

مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے گردن پکڑ لی اور لٹک گیا تو خوجی کیسقدر جھکے۔ انکا جھکنا تھا کہ اس نے اور بھی زور سے مکّا دیا تو مُنھ کے بھبل زمین پر۔ دو تین لپٹر صحیح کر کے پونا بھاگا اور خواجہ صاحب اس کی دُم کے ساتھ اس نے جاتے کے ساتھ ہی دروازہ بند کر لیا۔ خواجہ صاحب نے پٹخنی کھائی تو تماشائیوں نے قہقہہ لگایا۔ پس ان کے غصّہ کی کچھ نہ پوچھئے۔ آسمان سر پر اٹھا لیا "اوگیدی لوہے بزدل۔ گیدی اگر شریف زادہ ہے تو آ جا مقابلے پر۔ گیدی۔ زمین گرا تو بھاگ کھڑا ہوا۔"

آزاد نے بناوٹ کی راہ سے کہا " ارے میاں آخر یہ ہوا کیا۔ کون گرا کون جیتا۔ ہم تو اس طرف دیکھ رہے تھے معلوم نہیں کیا ہوا کس نے کسے مارا۔ خوجی اکڑ کر بولے " ایسی بات آپ کاہے کو دیکھنے لگے تھے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے گیدی کے مگر اس کا قد چھوٹا ہے۔ دیکھنے میں بونا ہے۔ مگر باون گز سے کم اس کا قد نہیں ہے۔ واللہ کشتی دیکھنے کے قابل تھی۔ میں نے ایک نیا پیچ کیا تھا۔ آج بھی چاروں شانے چت گرا اور اس کے گرنے کے وقت ایسی آواز آئی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑ پھٹ پڑا۔ آپ نے سُنا بھی ہو گا"

آزاد نے پوچھا " وہ ہے کہاں کیا کھود کے زمین میں دفنا دیا آپ نے"۔

" نہیں مردم آزاری سے منزلوں سے بھاگتا ہوں اور قسم ہے۔ واللہ پورا زور نہیں کیا ورنہ کیا میرے مقابلہ میں ٹھہرتا۔ توبہ توبہ۔ ہاتھ پاؤں توڑ کے چرمر کر ڈالتا۔ میں وہ جن ہوں گرتے ہی میں چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور خم ٹھونک کے سر خرو اٹھ کھڑا ہوا۔ نانی ہی تو مر گئی مردک کی ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں خون خشک ہو گیا پس روتا ہوا بھاگا"

" مگر خواجہ صاحب گرا تو وہ اور آپ کی پشت پر گرد کیوں اتنی لگی ہے

اس کا کیا سبب ہے "

"سچ کہوں اس مرتبہ میں اپنے زعم میں آپ ہارا اور پورا زور بھی تو نہیں کیا میں نے ورنہ لاش پھڑکتی ہوتی اور اب بھی ع چور جاتے رہے کہ اندھیاری۔

مس میڈا نے کہا "بڑے شرم کی بات ہے۔ ذرا سا بونا نہ گرایا گیا آپ سے۔

خوجی نے سر پیٹ کر جواب دیا "جی چاہتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹوں۔ بس اور کچھ نہیں غضب خدا کا کہتا جاتا ہوں کہ اس گیدی کا قد چور ہے۔ آخر میرا بدن چور ہے یا نہیں۔ اس وقت میرے تن پر انگرکھا یا دگلا کچھ نہیں ہے اس وقت ذرا میرے ڈنڈ دیکھئے گا اور ابھی کپڑے پہن لوں تو بڑی توم ہونے لگوں۔ جیسے چھٹا بٹیر۔ بس یہی فرق سمجھو۔ اگر آزاد داد نہ دیں گے رنج ہو جائے گا۔ اول تو میں گرا نہیں اس نے مجھے نہیں پچھاڑا۔ اپنا لنگر اپنے آپ نہ اٹھا سکا۔ اپنے زعم میں میں آپ ہارا۔ دوسرے اس کا قد چور ہے دو گز زمین میں اس کا دھڑ رہتا ہے۔ لنکا کی فوج کا ہے چھوٹے سے چھوٹا وہاں باون گز کا ہوتا ہے"

غرض اسکندریہ سے خوجی اور آزاد جہاز میں سوار ہوئے۔ جہاز بنا کسی خاص مزاحمت کے بمبئی کے قریب پہونچا اور ملاحوں نے کہا "اب بمبئی سامنے سے نظر آتی ہے" سنتے ہی خوجی کی باچھیں کھل گئیں چلا کر کہا۔ "یارو ذرا دیکھنا بی شتاب جان کی فنس تو نہیں آئی ہے۔ کرم بخش نامے تھری ساتھ ہو گی۔ اطلس کا چھٹکا ہے اور کہاروں پگڑیاں وردیاں رنگی ہوئی ہیں پھلیاں ضرور لٹک رہی ہونگی۔ بی شتاب جان ہوت۔ اے شتاب جان صاحب۔ آزاد پادشا آواز آئی ارے یار آواز آئی۔ خدا واسطہ بتا دو بی شتاب جان ابی کرم بخش خوری تھری کیا بری ہے"

لوگوں نے سمجھایا کہ ابھی بندہ گاہ تو آنے دیجئے بی شتاب جان اور
کرم بخش یہاں سے کیونکر سن لیں گی۔ کہا "اجی ہٹو بھی۔ تم کیا جانو کبھی کسی
پہ دل آیا ہو تو سمجھو ارے نادان عشق کے کان دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں۔
اور کون کوس گزری غزل کے کوس۔ کیا شتاب جان نے آواز نہ سُنی ہوگی۔
واہ بھلا کوئی بات ہے مگر جواب نہ دیا یہ پوچھو اس میں ایک لم ہے پوچھو وہ
کیا۔ وہ یہ کہ معشوق پن نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو۔ اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا
جواب دیں تو بندے کی نظروں سے گر جائیں۔ مزہ جب ہے کہ ہم بوکھلائے
ہوئے اِدھر اُدھر ڈھونڈتے اور آوازیں دیتے ہوں کہ بی شتاب جان صاحب
اجی بی صاحب اور وہ بجری میں پیچھے سے ایک دھول جمائیں اور تنک کے
کہیں ارے موئے کانا آنکھوں کا اندھا نام نین سکھ غل مچاتا پھرتا ہے۔
شتاب جان۔ شتاب جان۔ اور ہم دھول کھا کر عمداً کہیں کہ دیکھئے سرکار ایک
دھول لگائی تو خیر جواب دھول لگائی نہ تو بگڑ جائے گی۔ اور وہ جھلا کر
ایک اور جمائیں کہ اینجانب کی ٹوپی گھورے پر جا کے گرے"

اتنے میں ساحل بحر نظر آیا تو خواجہ صاحب نے غل مچایا "شتاب جان
صاحب اجی حضور غلام فرزندانہ آداب عرض ...."

اسقدر کہہ چکے تھے کہ لوگوں نے قہقہہ لگایا اور خوجی متحیر ہو گئے
کہ یہ کیا اسرار ہے۔ آزاد سے پوچھا کہ اس خندۂ بے محل کا کیا سبب ہے۔
آزاد بولے "آپ کی حماقت اس کا سبب ہے۔ یہ فرزندانہ آداب کیسا ہوتا
ہے۔ تو آپ کی بیوی کیا حضرت کی والدہ شریفہ ٹھہریں"
خوجی نے اپنے گالوں پر تھپڑ لگائے اور کہا "ارر ر۔ غضب ہو گیا۔
بُرا ہو گیا اور نشتر ہو گیا اسے خفت ہی خفت ہے مگر تھپڑ سے کی

زبان پھسل گئی لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے وقت ایسا کلمہ زبان سے نکلا اور وہ بھی اپنی پیاری شتاب جان کی نسبت۔ اب تو صاف صاف فقنس نظر آتی ہے وہ دیکھئے ہوا سے زلف درہم برہم ہوئی جاتی ہے سا سمجھ کر چھیڑا وہ مشاطہ اسکی زلف پر خم کو + خدا کے واسطے پرہم نہ کر اسباب عالم کو۔ وہ کھڑی سامنے ڈٹی کھڑی ہے۔ اخاہ اب تو بی کرم بخش بھی باڑہ پر ہیں۔ سرو قامت رشک شمشاد ہے اس جوڑ کر دار کی کھڑکی بھی پر ہیا دہے۔ وہ ہنسی۔ اہا ہو۔ ڈبو دیا ان نے مار ڈالا کیا پیارے دانت ہیں سو چمک لعل بدخشاں کی مثا ہے + ترے ہونٹوں پہ السیار تنگ پاں ہے یاران مژدہ باد کہ عروس مانوس من و نگار گلعذار من و صبیہ من بی شتاب جان داست جستہ از بحر و کہ زنگار مراحی بنیسہ یا نام خدا ہے کشتی میں۔ نا خدا آج پار بیڑا ہے ،،

اتنے میں جہاز لنگر انداز ہوا اور لوگ اترنے لگے۔ خواجہ صاحب دور ہی سے فرضی شتاب جان کو ڈھونڈھنے لگے "کرم بخش او کرم بخش اب خدا کے واسطے یہ چپ چپلے رہنے دے کمبخت معلوم ہے آپ نخرے باز ہیں مگر اب کب تک ترساؤ گی۔ لاحول ولا قوۃ میں نے ایک دن اس کھڑی سے دل لگی کی تبسے منھ چڑھ گئی ،،

بندرگاہ پر آزاد کے دوست مرزا صاحب آ گئے تھے۔ وہ خوجی اور آزاد کو اپنے گھر لے گئے خوجی افیم گھولنے میں مصروف ہوئے اور فرضی شتاب جان کو بھول گئے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر شتاب جان یاد آئیں اور انکی تلاش کرتے کرتے سرائیں پہونچے۔ یہاں ایک عورت کو شتاب جان فرض کر کے باتیں بنانے لگے۔ پھر افیم یاد آئی تو اتنی پی گئے کہ بیمار ہو گئے اول فول بکنے لگے۔ ایک حلبشی نے ان کی دیکھ بھال کی اور ڈاکٹر کو دکھایا۔ بارے کچھ دنوں میں اچھے ہو گئے

آخر یہاں سے چلے تو اثنائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے آدمی ایک مقام پر کھڑے باتیں کر رہے ہیں اور ایک گراں ڈیل پہلوان بیٹھا ہے یہ لوگ اس کی تعریف کر رہے ہیں کہ واہ استاد کیا کشتی نکالی ہے۔ اپنے سے دونے کو نیچا دکھایا۔

خواجہ صاحب نے اپنے ڈیل پر بھی نظر ڈالی اور پہلوانی کے زعم میں چلے مصافحہ کرنے۔

مصافحہ کے بعد کہنے لگے "ہم اسوقت اس قدر خوش ہیں کہ بس رشیہ خطمی ہو گئے واللہ اب اس سے زیادہ اور خوشی کیا ہوگی کہ ہم نے اپنے ایک جوڑ بدار کو پایا اور تم تو ہمارے بدن ہی سے سمجھ گئے ہو گے کہ ہمارا ساتھی پہلوان ہے۔

پہلوان نے پوچھا "تم کہاں کے پہلوان ہو بھائی صاحب"

"یار کیا بتائیں۔ اپنے ساتھیوں میں اب ایک بھی نہیں نظر آتا۔ شیدی سالمین۔ شیدی لندھور کے ساتھ کے لڑے ہوئے ہیں۔ اب کوئی پہلوان جچتا ہی نہیں"

"مگر کیا کاٹھی ہے اور ہاتھ پاؤں کیا سڈول ہیں کہ واہ واہ"

"میاں بڑے ریاض کئے ہیں اور تسپر میرا بدن چور ہے اور میرا قد بھی چور ہے۔ تم کہاں رہتے ہو پہلوان"

"ہم آج کل نواب ذوالفقار علی خاں کے یہاں ہیں"

"نواب ذوالفقار علی خاں!!!"

"جی ہاں جنکو بٹیروں کا بڑا شوق ہے۔ اپنے ایک بٹیر صف شکن علی خاں کو اب تک روتے ہیں اور قبر بھی بنی ہوئی ہے جسپر کندہ ہے مزار پر انوار مقبول بارگاہ لم یزلی ولی ... آگاہ ... حضرت صف شکن علی شاہ ... واللہ

مضجعہ وانارا للہ برہانہ۔ اور وہاں کوئی خوجی بھی سُنا بڑے ہنسوڑ آدمی تھے وہ وہاں مسخروں میں نوکر تھے"

"آزاد نامے بھی کوئی صاحب وہاں آتے تھے"

"جی ہاں وہ سانڈنی لے گئے ہیں مگر سنا وہ توکسی ملک میں لڑائی سر کر رہے ہیں۔ نواب صاحب سے ایک روز کسی نے کہا تھا کہ آزاد اور خوجی دونوں لڑائی پر گئے ہیں تو لوگوں نے یقین نہیں کیا کہ خوجی ایسے آدمی بھلا سمندر میں کیونکر گئے ہوں گے عمر بھر مسخرہ پن اور چانڈو بازی کیا کیے انکو جنگ اور مورچے سے کیا واسطہ مگر آزاد تو وہاں دُو دُو مشہور ہو رہا ہیں"

"یہ مرزا کمبخت کہتا ہوگا۔ اچھا گیدی۔ وہ مرزا سیتا بیگ گیدی۔ اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد ہی کرے"

"مرزا سیتا بیگ تو ہمارے ساتھ ہیں"

"واللہ۔ ہو ہو ہو۔ بڑی خوشی ہوئی"

"آج ہم نے دنگل کیا اور شام کی ریل سے چل دیں گے"

"بھائی ہم کو ضرور ساتھ لیتے چلو۔ آزاد تو اپنے یہاں پڑے رہیں گے۔ کیا معلوم کب پہونچیں۔ ہم تمھارے ساتھ چلیں گے۔ ہم اپنا کرایہ دیں گے"

الغرض شام کو پہلوان کے ساتھ خواجہ بدیع اسٹیشن پر آئے۔ یہاں مرزا سیتا بیگ ملے۔ انھوں نے کہا "اخاہ خواجہ صاحب ہیں۔ کہو بھئی خوجی اچھے تو رہے یار ہے"

"خوجی کہیں اور رہتے ہوں گے۔ اب وہ خوجی نہیں ہیں۔ ہمیں جناب مولانا خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع کہا کرو"

"ارے کمبخت بغلگیر تو ہو۔ اللہ اللہ"

"سرکار کیسے ہیں گھر میں خیر و عافیت ہے"

"سرکار فضل الٰہی سے اچھے ہیں بیگم صاحب پر کچھ آسیب تھا مگر اب ذرا ذرا تخفیف ہے۔ کہو تم نے تو خوب نام پیدا کیا"

"نام! ارے ہم میجر تھے میجر خواجہ سنا ہوگا"

"سرکار کو اس لڑائی کے زمانہ میں اخبار سے بہت شوق تھا۔ آزاد کا ذکر ہر روز نظر سے گذرتا تھا اور آپ کا حال پڑھتے تھے۔ آزاد کو تو سب جانتے ہیں مگر تمھارا حال جب سے پڑھا تب سے سرکار کو اخباروں کا اعتبار جاتا رہا۔ تم فقرہ باز آدمی نشہ پانی سے کام جنگ سے تم کو کیا واسطہ۔

"اب اس کا حال تو ان لوگوں سے پوچھو جو مورچوں پہ ہمارے شریک تھے۔ تم مزے سے بیٹھے بیٹھے ہماری پخیتیاں اڑا کیے تم کو ان باتوں سے کیا سروکار وہاں ہمارا ساتھ دیتے تو جانتے کہ بڑے مرد وے ہو"

"ایک مرتبہ تو خبر کے کاغذ میں لکھا آیا تھا کہ خوجی نے شادی کر لی ہے"

"ارے یار اس کا حال نہ پوچھو۔ اپنے حسن و جمال کا حال تو ہم کو باہر جا کے معلوم ہوا۔ جس ملک جس شہر جس جا پہونچ گئے کروڑوں عورتیں ہم پر عاشق ہو گئیں اور ایک سے ایک پری بیگم جھوٹ اگا ایک کمسن گلعذار برق کرداں ہے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اسپر میرے علاوہ پچاس ترکی افسر بھی عاشق تھے اور سات فرنگی۔ رائے یہ قرار پائی کہ جس سے وہ پری راضی ہو وہ اس کو عقد نکاح میں لائے۔ اس شوخ کی نظر آپ کے خادم پر ہی پڑتی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ معاً اٹھلاتی ہوئی آئی اور میرا ہاتھ لیکر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"ایں! واہ رے خوش نصیب تمھیں واللہ"

"اب سنئے کہ بعض کی آگ اُن سب کے دلوں میں بھڑکی کہ ہائے ہم نہ رہ گئے۔

جو شخص اس پری کے مطبوع طبع ہو وہ کل رقیبوں سے لڑے۔ ہم نے کہا خیر ہم نے کہا منظور۔ ہم جوانمرد ہیں۔ دس ترکی اور چار یورپین افسروں کو نیچا دکھایا۔ جب اتنے افسروں کو ایسی چوٹیں لگائیں کہ بلبلانے لگے خون بہہ نکلا اور تڑپ گئے خون نکلنا کیا معنے ارے توبہ بس تو پھر اوروں کے بھی کان ہوئے بولتے سب کے سب دو بنجاتے۔

اتنے میں گھنٹی بجی اور مسافر چلے تو پہلوان اور مرزا کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ بھی پلیٹ فارم پر آئے اور پہلوان کی طرح حضرت خود بھی اکڑتے جاتے تھے۔ اتنے میں دوسری گھنٹی ہوئی۔ خواجہ صاحب ایسے بوکھلائے کہ زنانے درجہ میں گھس پڑے۔ اینا لینا۔ دو دو یک الگ الگ دروازہ سر سے لگا۔ اب درجۂ اول میں گھس پڑے۔ صاحب نے ڈانٹ بتائی وہاں سے بھاگے تو اب مرزا صاحب کا پتہ نہ پہلوان کا۔ پکارنے لگے "مرزا صاحب۔ مرزا صاحب ارے یار پہلوان ہوت۔ او پہلوان لاحول ولا قوۃ۔ ارے یار دھر گئے۔ اہاہاہا اس بہروپیئے نے جھانسا دیا ہوگا۔ واللہ خوب سمجھا۔

اتنے میں مرزا صاحب نے پکار کر بلایا اور ریل پر اپنے پاس بٹھایا۔ خواجہ صاحب نے ریل پر سوار ہو کر جناب باری کا شکر ادا کیا۔ صحیح سلامت لبعد طے منازل و قطع مراحل جان بچا کر مع الخیر و عافیت داخل منزل مقصود ہوئے

(۸)

خواجہ بدیع شام کے وقت مع مرزا امیتا بیگ و پہلوان نواب صاحب کے ہاں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ دربار میں حواری موالی سب جمع ہیں۔

"آداب عرض ہے پیر و مرشد" خوجی پیترا بدل کر بولے

نواب نے متحیر ہوکر دیکھا اور کہا " اخاہ خوجی ہیں آؤ بھئی آؤ "

خوجی نے پھر آداب عرض کیا " حاضر ہوں خداوند " کہکر نواب صاحب کے قدم لئے اور بولے " الحمد اللہ کہ یہ سعادت ابدی پھر مجھے نصیب ہوئی "

غفور نامے ایک ملازم نے کہا " خوجی میاں سلام "

" سلام بھائی، مگر ہم کو خوجی میاں نہ کہنا۔ اب ہم فوج کے افسر ہیں بدیع پاشا " خوجی نے کہا۔

پھر نواب کی طرف متوجہ ہوکر بولے " خداوند حضور کے نمک کی قسم ملکوں ملکوں اس دربار کا نام کیا "

نواب بولے " شاباش خوجی۔ شاباش ہم نے اکثر اخباروں میں تمہاری تعریف پڑھی اور بہت محظوظ ہوئے "

خوجی نے سلام کرکے کہا " خداوند غلام کس لائق ہے مگر یہ کیا شرف ہے کم کہ تمہارا غلام ہوں + مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے "

اتنے میں نواب صاحب کی دداجی باہر آئیں اور خوجی کو دیکھ کر بولیں

" اخاہ خوجی آئے ہیں۔ اچھے رہے بیٹا "

" بندگی دداجی " خوجی نے کہا " ذری چھوٹی سرکار سے کہہ دیجئے کہ خواجہ بدیع بادشا حاضر ہے اور آداب عرض کرتا ہے "

نواب نے دداسے کہا " اور ان کا نام کبھی سنا۔ اب خوجی میاں نہ کہا کرو اب ان کو روم سے خطاب ملا ہے۔ بدیع پاشا "

" یہ تو مجھے نہ یاد رہے گا " دداجی نے کہا

خوجی بولے " دداجی تم کہہ دینا کہ حضور کا غلام خواجہ بدیع حاضر ہے اور آداب عرض کرتا ہے "

دوا چلی گئی تو ایک مصاحب نے کہا" ارے یار تو سمندر میں جہاز پر کیونکر سوار ہوا"۔

خوجی گرمائے" ہونھ! یہ سمندر میں جہاز پر کیونکر سوار ہوا۔ موریچوں پر جرنیلوں اور سپہ سالاروں اور کرنیلوں سے بھڑ بھڑ پڑے ہیں اور مارتے مارتے مارتے مارتے بڑے بڑے کرارے اور تجربہ کار افسروں کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ پلونا کی جنگ میں خداوند دس لاکھ آدمی ایک طرف اور ستر سواروں کے ساتھ غلام دوسری طرف۔ پھر یہ ملاحظہ فرمائیے کہ چودہ دن برابر مقابلہ کیا اور چھکے چھڑا چھڑا دئیے"۔

نواب بولے" بھئی اس میں تو شک نہیں تم نے بڑا اچھا لاپن کیا۔ خبردار آج سے ان کو کوئی خوجی نہ کہے بدیع پاشا کے لقب سے پکارے جائیں"۔

خوجی نے سلام کر کے عرض کی۔ اب تو حاضر ہوا ہوں۔ دیکھئے گا کیا کیا باتیں عرض کرتا ہوں۔ خداوند جس طرح زار روس رہتے ہیں اسیطرح حضور کا طرز معاشرت ہو تو ہی چند دنوں کے بعد آزاد بھی لکھنؤ میں آپہونچے مس میڈا اور مس کلیرسا کو ہوٹل میں چھوڑا اور گاڑی کر کے نواب صاحب کے دولت خانہ پر آئے۔ اِدھر گاڑی سے اُترے اُدھر خدمتگاروں دربانوں سپاہیوں خواصوں نے غل مچایا کہ خداوند محمد آزاد پاشا تشریف لائے ہیں۔ نواب صاحب رفقا مصاحبین احباب سب کے سب گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ آزاد پاشا رپ رپ کرتے ہوئے ترکی فوجی وردی ڈانٹے چلے آتے ہیں۔ نواب صاحب نے جھپٹ کر مصافحہ کیا اور گلے لپٹ گئے اور یوں ہمکلام ہوئے۔

" بڑا نام کیا واللہ کروڑ آدمی ایک طرف اور ایک طرف سینہ سپر جاں بکف لڑے"۔

خوجی بولے" غلام بھی آداب عرض کرتا ہے

آزاد نے خوجی سے ہاتھ ملا کر کہا " دل خواجہ بدیع الزماں "
نواب نے پوچھا " کیا ! خواجہ کون - بدیع الزماں - بدیع الزماں کب سے ہوا - خوجی کہیے صاحب - بدیع الزماں ! "
" حضور " خوجی بولے " یہاں خدا جانے کون کو ملک دیکھ آئے ہیں -
نواب صاحب آزاد سے بولے " سُنا آپ نے تین تین کروڑ آدمیوں سے تن تنہا مقابلہ کیا " اور پھر نوکر کو حکم دیا " ارے بھئی گنگا جمنی حقّہ بھر لاؤ آپ کے واسطے "
خوجی بولے " خداوند میرے پر ان کو حضور دیکھتے تو عش عش کر جاتے جیسے شیر کچھار میں ڈکارتا ہے سہ بلبل بیدل برنگ گل در بند قبا + در دلِ شوریدہ پنہاں دود پنہاں کسی ست "
" سبحان اللہ " آزاد نے کہا " بعد مدت آپ کی زبان سے برجستہ شعر سُنا "
نواب مسکرا کر بولے " مردود ہمیشہ گدھا ہی بنا رہے گا -
" خداوند اب بندہ وہ خوجی نہیں ہے "
" ابے نامعقول اس بے محل شعر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی - بلبلِ بیدل سے یہاں کیا سروکار ہے "
" خیر حضور مالک ہیں جو چاہے سو کہہ لیں "
نواب صاحب نے آزاد سے پوچھا " کیوں جناب انھیں نے کوئی کشتی نکالی تھی "
" میرے سامنے تو دو چار نہیں دو چار ہزار بار دھپیائے البتہ گئے تھے اور ایک بونے تک نے ان کو اٹھا کے دے مارا تھا - عورتوں نے گدّے دھیلے - تو گز گز بھر زمین سے نیچے گرے "

مصاحبین نے قہقہے لگائے۔ ایک بولا۔ واہ بھئی خوجی واہ" دوسرے نے کہا "اس وقت تو بھبا ڑا پھوٹ گیا"

نواب صاحب نے فرمایا "پرسوں تو کہتے تھے کہ مصر میں ہم نے آزاد کے برابر کے ایک پہلوان کو دم بھر میں آسمان دکھایا"

آزاد نے کہا "گھر کی چکی اور باسی ساگ۔ آسمان دکھایا ایک بوٹے تک نے گردن ناپی اور اٹھا کے دے مارا۔ چلے وہاں سے دون کی لینے"

"اجی یہ ہمیشہ کا جوتی خوردہ ہے" نواب نے کہا۔

اتنے میں نواب صاحب کے ہاں ایک منشی صاحب تشریف لائے۔ آزاد سے تعرف کرایا گیا اور بولے "اخاہ حضور جنرل محمد آزاد پاشا صاحب ہیں حضور تو بڑا نام پیدا کیا۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ"

خوجی بولے "اجی جناب میدان کارزار میں آپ دیکھتے تو عش عش کر جاتے گھوڑا دبایا اور لاکھ آدمیوں کے پرے میں کڑ کڑا تے ہوئے دن سے موجود"

منشی جی نے کہا "آپ نے بھی بڑا ساتھ دیا خواجہ صاحب۔ مگر آپ کی بہادری کا کہیں ذکر نہیں سننے میں آیا ہے"

"آپ ایسے گیدیوں کو میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں نے وہ کارنمایاں کئے ہیں کہ باید و شاید قرولی ہاتھ میں لی اور صفوں کی صفیں صاف کر دیں"

خواجہ صاحب نے کل حاضرین کو مخاطب کر کے جنگ کے حالات کا یوں سماں باندھا "جس روز آزاد پاشا اور ہم پلونا کے قلعہ میں تھے اس روز کی کارروائی دیکھنے کے قابل تھی۔ قلعہ مذکورہ پانچ طرف سے محصور تھا"

ایک مصاحب نے بات کاٹی "جی چار طرف سے محصور ہونا تو مشہور ہے۔

یہ پانچوں کون طرف آپ نے پیدا کیا۔ جو بات کہو گے وہی انوکھی "
تم ہو گدھے کسی نے بات کی اور تم نے کاٹ دی۔ یوں نہیں ووں۔ ووں نہیں یوں۔ ایک طرف دریا تھا اور خشکی بھی تھی۔ اگر جنوب کے سمت دریا ہی سے محصور کرتے تو فوج قلعہ خشکی سے نکلجاتی اور اگر صرف خشکی ہی پر قبضہ ہوتا تو اُتر کی سمت سے نکل بھاگتی۔ یہ خرابی تھی مگر تم ایسے گوکھوں کو اس کا کیا حال معلوم کبھی جنگ پر گئے ہو۔ کبھی توپ کی صورت دیکھی ہو۔ کبھی دھواں تک تو دیکھا ہو گا اور چلے ہیں وہاں سے کڑیل کے بچے بن کر۔ بس قبلہ و کعبہ اب کریں تو کیا کریں ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے کہ یا الٰہی کیا ہونا ہے اب۔ جائیں تو کدھر سے اور بھاگیں تو کدھر سے اور روسیوں کی یہ کیفیت کہ گولے برسا رہے تھے اور ہر طرف سے آگ برس رہی تھی۔ سب ترکی گھبرائے ہوئے کہ یا کہ یا الٰہی اب کیا ہو گا۔ پس آزاد پاشا نے مجھ سے کہا کہ بھائی جان اب کیا سوچتے ہو۔ مدد دوگے یا نکلجاؤ گے۔ میں آگ بھبھوکا ہو گیا کہا نکلجانا کیا معنے۔ آزاد نے کہا پھر نکل نہ جانا۔ میں نے کہا بسم اللہ چل کر دیکھ لو۔ اب اتنے میں قلعہ کی دیواریں چلنی ہو گئیں اور پچاس طرف سے گولے برسنے لگے۔ پس آزاد پاشا نے سب فوج محصور سے کہدیا کہ اب قلعہ کی دیواریں توڑ کر ہم نکلنے والے ہیں۔ یہ کہکر مجھ سے کہا کہ تم سب کے مقدمہ الجیش ہو اور بندہ مسلح ہو کر ختلی عربی نژاد ہوا نہاد پر سوار ہوا گھوڑے کی کیفیت یہ کہ اڑتا ہوا جاتا تھا۔ اس مقام پر یہ حال تھا کہ غ بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر۔ قلعہ کے باہر میری شمشیر خونشں غلاف جو چمکی تو دو دکھ روسیوں کو تہ تیغ کیا۔ دو لاکھ پورے دو لاکھ "

" اس جھوٹ پر خدا کی مار" ایک مصاحب بول اُٹھے "ارے کمبخت کیوں لطف سخن کھوتا ہے اور سب سچ کہا مگر یہاں پر آنکر منھ کے بھل گرا۔ اسے

لعنت خدا کی"

نواب صاحب بولے" واللہ مجھے ابتک لطف آتا تھا مگر اس نے ڈو لاکھ آدمیوں کا ذکر کر کے کل لطف خاک میں ملا دیا"

"اچھا آزاد سے پوچھئے بیٹھے تو ہیں سامنے" خوجی نے کہا"

نواب صاحب آزاد سے بولے" حضرت سچ سچ کہئے گا"

"جناب والا" آزاد بولے" صاف یہ ہے کہ پلونا کی تو انکھوں نے صورت بھی نہیں دیکھی ۔ یہ تو ان دنوں میں خاص قسطنطنیہ میں تھے ۔

اس پر بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا اور آواز دیر تک گونجا کی ۔ محل کے اندر آواز گئی اور بیگم صاحب نے نواب صاحب کو اندر بلا بھیجا ۔ اس اثناء میں خوجی آزاد کو الگ لے گئے اور بولے" اس دربار میں میرے ذلیل کرنے سے اگر کچھ پائیے تو اختیار ہے آپ کو" اور سر پیٹ کر بولے" ہائے افسوس عمر بھر ساتھ دیا ۔ جان لڑا دی اور اس دربار میں جہاں رزق کا سہارا ہے آپ ہم کو اُلو بناتے ہیں ۔ تاکہ روٹیوں سے جائیں"

آزاد نے کہا" بھئی اچھا اب تمہاری ہی سی کہیں گے"

"مجھے ورنگ ، تو باندھنے دو ذرا"

"آپ رنگ جمائیں بندہ تائید کرے گا"

اتنے میں نواب صاحب باہر آ گئے ۔ اور دونوں کو باتیں کرتا ہوا دیکھ کر بولے" خوجی بھئی یہ کیا سرگوشی ہو رہی ہے"

خوجی بولے" خداوند ملکی معاملات پر بحث ہو رہی تھی"

"ملکی معاملات کیسے"

"حضور میری رائے ہے کہ اس ملک میں بھی ملک نواز بلند کی طرح نہریں

جاری ہونی چاہییں اور آزاد پاشا کی رائے ہے کہ نہروں کے ذریعہ سے آب پاشی تو ممکن ہے مگر آب و ہوا خراب ہے"

دوسرے مصاحب بولے" اخاہ تو یہ کہئیے آپ شہر کے اندیشہ سے دبلے ہیں"

خوجی بولے" تم کو کیسے یہ باتیں کیا جانو پہلے اتنا تو بتاؤ کہ ایک بالٹی میں کتنی توپیں ہوتی ہیں۔ چلے وہاں سے جالینوس کی دم بنکے۔

نواب نے کہا" ہم دیکھتے ہیں گو شری ہے مگر باتیں ٹھکانے کی کرتا ہے"

آزاد نے کہا" تو ان امور میں تو ان کو واقعی دخل ہے۔ صاحب سفر بھی تو اسقدر دور دراز کا کیا تھا"

" اور نہ کہ ہم ایسے عالم و فاضل" خوجی نے کہا۔

مصاحبین نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ایک مصاحب نے پوچھا" کیوں خواجہ صاحب پہاڑ تو آپ نے کثرت سے دیکھے ہونگے۔

" ایک دو۔ کروڑوں۔ بلندی کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں"

نواب صاحب نے دریافت کیا" بھلا آسمان وہاں سے کتنی دور رہ جاتا ہے"

" حضور کوئی ایک دن کی راہ ہے۔ مگر زینہ کچا"

" اور کیوں صاحب وہاں سے بخوبی معلوم ہوتا ہوگا کہ مینہ کس جگہ سے آتا ہے" نواب نے پوچھا۔

" خداوند پہاڑ کی چوٹی پر میں تھا اور مینہ نیچے برس رہا تھا یہ ایک ہی دفعہ نہیں دیکھا بلکہ صد ہا بار" ہم اوپر سے دیکھ رہے ہیں کہ نیچے مینہ برستا ہے اور جہاں ہم ہیں وہاں کچھ بھی نہیں"

نواب نے آزاد کی طرف رخ کیا" کیوں صاحب یہ سچ ہے عجیب بات ہے بھئی"

" جی ہاں آزاد بولے پہاڑ کے نیچے بارش ہوتی ہم پہاڑ پر سے دیکھ رہے ہیں"

ایک مصاحب نے کہا "اور یہ جو مشہور ہے کہ بادل تالابوں میں پانی پیتے ہیں "
"یہ تم ایسے گدھوں میں مشہور ہے" خوجی نے تڑ سے جواب دیا۔
نواب مسکرائے اور بولے "بھئی یہ تجربہ کار لوگ ہیں جو بیان کریں وہ صحیح ہے"
"اور خداوند دریا کے مخزن ہم نے دیکھے "
"مخزن۔ دریا کا مخزن؟" نواب نے زبان دبا کر کہا۔

"ہاں خداوند جہاں سے دریا نکلتا ہے۔ عجب مقام ہوتا ہے۔ دریا ڈینوب کا نام آپ نے سنا ہی ہوگا۔ اتنا بڑا دریا ہے کہ سمندر اس کے مقابلے میں شرما جائے اور مخزن جو جا کے دیکھا تو ہوش اُڑ گئے۔ حضور اتنا بڑا دریا اور ایک رئیس کے دیوان خانہ کے احاطہ سے نکلا ہے "

"مکان کے احاطے سے" نواب صاحب متعجب ہوئے "جیسے یہ ہمارے مکان کا احاطہ "

"بلکہ اس سے بھی چھوٹا حضور خدا کی خدائی اسمیں بندے کو کیا دخل ہے بیچارے کو !!! اے تو یہ.... اور خداوند ہم نے ایک مقام پر دیکھا کہ جسقدر شہر ہے سب لب دریا ہی بسا ہے اور صرف ایک قطار ایک صف۔ اور خداوند ہم نے ایک مقام پر دیکھا کہ جسقدر شہر ہے سب لب دریا ہی بسا ہے اور صرف ایک قطار ایک صف۔ اور خداوند ستفیبل میں ایک جانور خانہ ہے۔ اس میں ہم نے ایک بھینسا دیکھا۔ بھینسا کیا ہاتھی کا پاٹھا تھا اور ناک کے اوپر ایک سینگ۔ یہ ارنا بھینسے سے بڑا ہوتا ہے۔ نہایت قوی ہیکل جانور۔ بڑا گراں ڈیل اور طاقتور اتفاق سے جس مکان میں بند تھا اس کی سلاخوں میں سے تین سلاخیں ٹوٹ گئیں اور وہ جناب سمٹ سمٹا کے نکلا تو معاذ اللہ کا مقام ہے بس کچھ نہ پوچھو ہوش اُڑ گئے۔ دو ہزار آدمی گدبد ایک کے اوپر دوسرا اور دھش پر دھشتوا اس طرح گرے کہ بیہوش کوئی چار پانچ سو آدمی زخمی ہوئے کسی کا ہاتھ ٹوٹا کسی کا منھ ٹوٹا کسی کا سر پھوٹا اور جو بیس آدمی

جان سے گئے۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اگر تم بھی بھاگتے ہو تو بڑی مٹی ہو گی۔ لوگ کہیں گے کہ یہ کیدانی کیا کرتے تھے۔ ذرا سے اڑنے کھٹمنے کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ خیر قبلہ بس ایک دفعہ جھپٹ کے جو جاتا ہوں تو گردن ہاتھ میں آئی بس بائیں ہاتھ سے گردن دبائی اور دبوچ کے بیٹھ گیا پھر لاکھ لاکھ زور مارے اُس نے بہت تڑپا مگر کیا مجال ہم نے ہلنے نہ دیا۔ میں نے جنجھوڑ ڈالا۔

"بس بس" ایک مصاحب بولے "قلعی کھل گئی غضب خدا کا جھوٹ بھی تو کتنا۔

"قسم خدا کی جو ابکی کوئی کلمہ زبان سے نکلا تو اتنی قرولیاں بھونکونگا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔ تو اپنے دل میں سمجھا کیا ہے۔ یہ سوکھی ہڈیاں لوہے کی سلاخیں ہیں۔"

نواب صاحب نے آزاد سے دریافت کیا کہ اتنے بڑے جانور سے انسان مقابلہ کر سکتا ہے آزاد تو خوجی سے وعدہ کر چکے تھے انکار نگ پھیکا نہ ہونے دیں گے۔ انہوں نے کہا "نواب صاحب بات یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو ملکہ حاصل ہے کہ ادھر جانور کو دیکھا اُدھر اُسکی گردن پکڑی اور شہ رگ کو اس ترکیب سے دبایا کہ جانور کسی مصرف کا نہ رہے"

"بس ہم کو یقین آگیا" نواب صاحب بولے۔

"آزاد نے خوجی کو اشارہ کرتے ہوئے کہا" کچھ اور بھی تم نے بیان کیا یا نہیں خواجہ صاحب۔

"حضور نے قطعی ممانعت کر دی تھی" خوجی بولے۔

"کیا کیا" نواب صاحب پوچھنے لگے "کیا ہم سے کچھ چوری کی بات ہے۔

آزاد نے کہا "پیر و مرشد صف شکن علی شاہ وہاں ملے تھے"

"واہ لو صاحبو سنو" نواب صاحب نے بہ آواز بلند کہا "ارے میرا صف شکن علی شاہ"

سب مصاحبین ایک زبان ہو کر بول اٹھے جزاک اللہ۔ جزاک اللہ
واہ رے صف شکن علی شاہ"

"خداوند" خوجی نے شروع کیا "اس ڈپٹی ڈپٹ کا بیٹیر بھی کم دیکھا ہوگا۔"
بھلا کسی مورچے پر گئے تھے یا نہیں۔ دور ہی سے دعا دیا کیے" نواب نے
آزاد سے پوچھا۔

خوجی بولے "ساتھ تو سچ پوچھیے تو میرا ہی اُنکا ہیت رہا۔ ان کی انگریزی
وضع سے بہت چکراتے تھے۔ مگر خداوند غلام جو عرض کرے گا کسی کو یاد نہ آئے گا۔
اور یہ آپ کے پاجی مصاحب مجھے جھوٹا بنائیں گے اور میں جھنجھلاؤں گا اور
مفت کی ٹھائیں ٹھائیں ہو گی"

"کیا مجال۔ خدا کی قسم اب تم میرے رفیق خاص ہوئے"
"یہ حضور کے اقبال کا اثر ہے خداوند ورنہ من آنم کہ من دانم کا نقشہ
ہے ارذل خلائق ہیچمیرز۔ ہیچمدان نالائق زد خلائق مردود و مطرود نامعقول ہو
حضور بات یہ ہوئی کہ غلام لب چشمہ سارا ایک پیالی میں آہستہ آہستہ افیم گھول
تھا کہ بس درخت کی طرف جو نظر کرتا ہوں تو نور کا عالم۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے
یا خدا یہ کیا اسرار ہے غور کر کے دیکھا تو روشنی پہلے تو میں سمجھا کہ چنار کا درخت
ہے۔ مگر دم کے دم میں ہمارے حضور صف شکن پھر سے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے"
"شکر خدا۔ ہزار شکر خدا۔ بڑے خوش ہوئے ہو گے"
"حضور جیسے کم ہوئی دولت پیہ مل گیا۔ دنیا بھر کی اقلیم کے مالک بن بیٹھے
حضور کا حال بیان کیا۔ یہاں کا ذکر چھیڑا۔ سرکار کی بیقراری اور فراق میں
نصیب اعدا گریہ وزاری کا حال کہا۔ بس حضور پھر تو کیفیت یہ تھی کہ کسی لڑائی
میں بشفہ تم ہی نہ سکے بیچ ۔۔۔ اور سیولی نے تو پوری پتی لگائی اور اُدھر

میرے شیر نے کیل ٹھونک دی"

"ایں۔ آہاہاہا۔ واللہ اے میرے صف شکن علی شاہ" نواب نے کہا۔
مصاحبین بولے "خداوند جانور کیا جادو ہے۔ سحر ہے پرکالۂ آتش ہے"
خوجی نے بات پکڑی "جانور۔ جانور آپ خود ہیں۔ ایسا ثقیل اور سخت
اور نا ملائم لفظ ان کی شان میں آپ استعمال کرتے ہیں۔ نامعقول"
نواب برہم ہو کر مصاحبین سے بولے "تم کو اچھی طرح رہنا ہو تو رہو ورنہ
اپنے گھر کا راستہ لو" اس کے کیا معنے آج کو صف شکن کو جانور بنایا کل کو
مجھے جانور کہو گے۔ مصاحب ہو کہ آقا"
مصاحبین خاموش ہو گئے خوجی اور اکڑے "ہونھ صریح کمالات کا
حال سن چکے مگر تب بھی اپنی ہی سی کیے جائیں گے۔ دوسرا اگر اسوقت جانور
کہتا تو کلیجہ ہڑے چیر کے دھر دیتا مردک کے۔ ہنوئی قردلی"
خواجہ صاحب نے ایک جنگ دریائی کا حال یوں بیان کیا "خداوند نعمت
خشکی میں تو سب کوئی لڑ سکتے ہیں مگر تری میں لڑنا البتہ کار دارد یوں حضور
تری کی جنگ میں صف شکن اور بھی سب سے بڑھ کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر
ہے کہ چھوٹا سا دریا تھا اسطرف ہم اُسطرف غنیم۔ لب دریا مورچہ بندی ہو گئی
اور گولیاں چلنے لگیں۔ دھنا نا۔ بس خداوند میں کیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن
موجود۔ آتے ہی دیکھا آؤ نہ تاؤ ایک کنکری لے کے کچھ پڑھ کے اس زور سے
پھینکی کہ ایک توپ پھٹ گئی اور ہزار ٹکڑے ہو گئے"
"ایں واہ واہ واہ۔ کیا کہنا ہے" نواب بولے "اس کنکری کو ملاحظہ فرمائیے گا۔
کیا بلا کی کنکری ہے۔ ایں واہ۔ اللہ اللہ دسو ٹکڑے توپ کے اور چار ہزار
روپے بحر [illegible] معقول [illegible] کی شان [illegible] واہ ... میرے [illegible]

واللہ ہم نے تیری قدر نہ کی "
تمام مصاحبین تعریفیں کرنے لگے۔

خوجی کہتے گئے "خداوند چودہ توپیں اُڑا دی گئیں اور جتنے آدمی بیٹھے تھے سب تربتر ہو گئے۔ کچھ پوچھئے نہ حضور آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا۔

نواب صاحب اور مصاحبین کا عالم یہ کہ تعریفوں پر تعریفیں کر رہے ہیں۔

اتنے میں مہری نے آکر کہا کہ حضور ذرا ضروری کام ہے بیگم صاحب بلاتی ہیں۔ نواب صاحب خوجی کو لے کر زنان خانے چلے۔ خوجی کی آنکھ پہ دوہری پٹی باندھی گئی۔

خوجی کو ڈیوڑھی میں چھوڑ کر نواب صاحب اندر گئے اور بیگم صاحب سے بولے "ہمارا ایرانا رفیق خواجہ بدیع الزماں جس کو ہم لوگ خوجی خوجی کہتے ہیں جنگ کے میدان میں صف شکن سے ملا تھا اگر اجازت دو تو یہاں بلا لوں پھر اسکی زبان سے انکا حال سنو۔

بیگم بولیں" اوئی جہنم میں جائے موا۔ اور سنو اس افیمی کو گھر کے اندر لائیں گے "

" اچھا ڈیوڑھی سے کہئے " نواب صاحب نے کہا۔

" ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ بگر میں ان موے لنگاڑوں خوشامد خوروں کے نام سے جلتی ہوں ان کی صحبت میں ان دہاڑوں کو پہونچے "

نواب صاحب نے خوجی کو حکم دیا "بھئی ذری توپ والا ذکر پھر چھیڑ دو "

"خداوند کیفیت یہ ہوئی کہ دریا کے دونوں طرف آمنے سامنے گھوڑ چڑھی توپیں اور سپاہی بندوقیں چھتیائے ہوئے گولیاں چلا رہے تھے۔

بس صف شکن نے ایک کنکڑی اٹھا کر خدا جانے کیا افسون پھونک دیا کہ کنکری پھینکی اور ادھر توپ کے دو سو ٹکڑے اور ہر ٹکڑے نے سو سو دو سو کی جان مار دی۔

بیگم جھلا کر کہہ اٹھیں اس جھوٹ کو آگ لگے۔ افیم پی پی کے نگوڑوں کو کیا کیا سوجھتی ہے

خوجی بولے "خداوند عورتوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہ آئیں گی حضور وہ بیچاری کیا جانیں"

بیگم کو غصہ آ گیا بولیں "دربان سے کہو کہ اس نگوڑے خوشامد خورے کو جوتے مار کے نکال دو"

بیگم صاحب کی نوکرنیاں ڈیوڑھی میں آ گئیں کسی نے کان لئے کسی نے چپت دی۔ کسی نے جوتیاں رسید کیں۔ یہ آگ بھبوکا ہو گئے مگر سوچے کہ نواب صاحب نے تو آج اسقدر انعام بخشا ہے اگر سب لوگوں پر کھل جائیگا کہ نوکرنیوں کی جوتیاں کھائیں تو بات بیڈھب ہو گی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ خاموش ہو رہو جھاڑ پونچھ کر باہر آئے۔ برف کا پانی پیا ٹھنڈے ہوئے گلوری چکھی اور لیٹ رہے"

(۹)

آزاد مس کلیرسا اور مس میڈا کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ تینوں ایک میم کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ اتنے میں کمرے کے باہر سے آواز آئی "بھلا رے گیدی بھلا خبردار ابھی اطلاع دے ورنہ اتنی قرولیاں بھونکونگا کہ یاد ہی تو کرے گا" آزاد بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میز پر سب لوگ متحیر کہ یہ کس بات پہ ہنسے ہیں۔

آزاد نے خانساماں سے کہا "دیکھو یہ کس کی آواز تھی"

خانساماں نے باہر جا کر کہا "کون غل مچاتا تھا"

خوجی بولے "غل مچاتا تھا! گویا ہم نفرے ہیں۔ آزاد پاشا سے کہدو کہ خواجۂ خواجگان حضور خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع تشریف لائے ہیں۔ ابھی اسی دم اطلاع دو"

"بہت اچھا تو آپ ذرا دم بھر ٹھہریں"

"اوگیدی ہم کوئی نفرا نہیں ہے۔ ہم روم و شام کوہ قاف سب کہیں پھر آیا ہے"

"اے تو صاحب ابھی کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں"

"ول تم اطلاع دو جاکے۔

خانساماں کمرے میں جاکر بولا "کوئی خواجہ صاحب آئے ہیں"

"بلاؤ۔ بلالو" آزاد نے کہا اور ہم کی طرف متوجہ ہوکر بولے "یہ صاحب بھی میرے ہمراہ روم گئے تھے۔ دیکھنے کے قابل آدمی ہیں"

خوجی داخل ہوتے ہی بولے "من خواجہ بدیع ہستم۔ بابائے من"

آزاد نے مسکراکر کہا "خاموش، اے گیدی خر۔

"توصیف من خویش نہ کہ من میکنی من چہ قابل تا خود توصیف یعنے خودستائی کردی سہ چوں باد دم از بہار میزد + گہ بر گل و گہ بہ خار میزد"

"ایں چہ بک بک می کنی۔ خر گیدی خاموش باش"

"اندرون ایں عمارت سر خود پیدا کنم"

"تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی"

"افوہ۔ واللہ۔ بہ دہان خود خوردم۔ اے ہے"

"بیا۔ بیا۔ مگر از حرکات مجنونانہ احتراز بکن"

"خیر صاحب بس اب یہ کہو کہ حسن آرا کو بھی خبر ہوئی یا نہیں نہ ہوئی ہو تو بندہ پہونچے۔ واللہ مجھ پیر فرتوت سے زیادہ اس کام کے قابل اور کسی کو نہ پاؤ گے۔ میں بڑے کام کا آدمی ہوں"

"اچھا کیا غضب کیا کھانے سے فراغت ہولے تو باہم مشورہ کریں"

اثنائے گفتگو میں میم صاحب نے کہا کہ حسن آرا بیگم نے کئی بار ایک بونے کا ذکر کیا تھا اور وہ کہتی تھیں کہ آزاد کے ہمراہ ایک مسخرہ بونا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں یہ وہی ہیں۔ آزاد بہت ہنسے اور خوجی کی طرف دیکھ کر کہا "جی ہاں یہ وہی مسخرے ہیں۔ نہایت معقول آدمی ہے مگر ذرا سنکی۔ مغرور۔ یاوہ گو اور مجنون اور بات بات پر لڑ پڑتا ہے۔ ذرا کسی سے بات ہوئی اور یہ مشت مشت پر آمادہ ہو گئے۔ بدن میں طاقت برائے نام بھی نہیں نتیجہ ظاہر ہے مگر یہ بے لڑے نہ رہیں گے

خواجہ صاحب انگریزی خاک نہیں سمجھتے تھے مگر باتوں میں اس قدر تاڑ گئے کہ اپنجانب ہی کا ذکر خیر ہے خونخوار ہو کر آزاد سے یوں مخاطب ہوئے

"سنو میاں خواجہ بدیع صفت زبان ہے۔ وہ کونسی زبان ہے جس سے یہ واقف نہیں۔ فرمائیے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ اردو۔ فرانسیسی سب میں عبور انگریزی زبان کا بادشاہ۔ میں سمجھ گیا کہ تم از بسکہ شریر ہو فلہذا میرے باجی اور بندہ کسی را بکدام وجہ بدیدو نہ گفتند وبس"

"تم کو تو ہے جنون۔ تم سے واسطہ کیا۔ تمھارا ذکر کس نے کیا"

"ان گھڑوں میں لونڈے آتے ہوں گے جی"

الغرض کھانے کے بعد بات چیت میں طے پایا کہ خواجہ صاحب حسن آرا کے یہاں جائیں۔ خوجی ادھر ادھر گشت کر کے حسن آرا بیگم کے محل سپہر تواماں میں داخل ہوئے۔ پیر مرد بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

سلام علیکم۔ خوجی نے کہا "پہچانا۔ ایسے جلد بھول گئے"

"علیکم السّلام" پیر مرد نے کہا "میں نے آپ کو نہیں پہچانا"

"تم کیا پہچانو گے۔ تمھاری آنکھوں میں تو چربی چھائی ہوئی ہے۔ تم بھلا ہمیں کیا پہچانو گے"

"کیا آپ تو کچھ عجیب مخبوط الحواس معلوم ہوتے ہیں یہ وجہ کیا کہ جان نہ پہچان خواہ مخواہ کے لئے دس باتیں سُنا دیں"

"اجی ہم تو سنائیں بادشاہ کو تو کیا مال ہے گیدی"

"اپنی ہوش میں اپنے ہے یا نہیں یہ بکتا کیا ہے تو"

"کوئی ہے محلسرا میں حسن آرا بیگم کو اطلاع دو کہ مسافر آئے ہیں. مہمانی کرو ہماری۔

پیر مرد نے استادہ ہو کر غور سے دیکھا تو بولے" اخاہ خواجہ صاحب تو نہیں ہیں. معاف فرمائیے گا۔ آئیے بغلگیر ہوں"

" بھلا بے جانے بوجھے کوئی کسی کو کچھ کہتا ہے۔

آپ تشریف رکھیں میں خود جا کے اطلاع کر دوں. خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ اور ہمارے آقائے نامدار اور عزیز میاں آزاد صاحب خیر و عافیت سے واپس آئے"

آدمی کو حکم دیا کہ حقہ بھروادو. اور آپ کے سامنے لگاؤ بندہ ابھی حاضر ہوا یہ کہکر پیر مرد خوش خوش اندر گئے اور با آواز بلند کہا لو صاحب پس ماندے کا پیش خیمہ آیا. خوجی داخل ہو گئے۔

جس نے سُنا انتہا سے زیادہ خوشی حاصل ہوئی کہ خوجی آئے ہیں. حسن آرا بیگم اور سپہر آرا اور روح افزا اور نازک ادا بیگم باغ کی طرف کے کمرے میں گئیں اور چلمنوں سے خوجی کو دیکھنے لگیں جانی بیگم اور گیتی آرا بھی آئیں۔

خواجہ صاحب فضل خدا سے خوش قطع تو تھے ہی. ان کو دیکھ کر سب کی سب ہنس دیں۔

نازک ادا بیگم بولیں "اہو ہو گیا گراں ڈیل سڈول جوان ہے۔ ارے ادھر موئے خوجی۔ او بہرے خوجی"

خوجی نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولے "کون ہے بھئی"

نازک ادا چلمن کے پیچھے ہنسیں اور بولیں "اِدھر دیکھ موئے تجھ پر خدا کا قہر نازل ہو۔ ادھر دیکھ آنکھیں ہی پھوٹیں جو ادھر دیکھے"

جانی بیگم بولیں "اللہ جانتا ہے ایسا عجیب و غریب آدمی نہیں دیکھنے میں آیا۔ اونٹ کی تو کوئی کل شاید درست بھی ہو۔ اس کی کوئی کل درست نہیں ہنسی آتی ہے"

خوجی اِدھر اُدھر دیکھتے کہ یا خدا یہ آواز کہاں سے آتی ہے۔ اتنے میں پیر مرد آ گئے۔ خوجی نے ان سے کہا "حضرت اس مکان کی عجب خاصیت ہے آوازیں آتی ہیں۔ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آواز آئی دوسری آواز آئی قہقہے کی آواز آئی۔ کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ مجھ کو بُرا بھلا کہا"

"آپ کیا فرماتے ہیں میں نے تو آجتک کوئی بات اس قسم کی دیکھی نہیں۔"

"تو اس کے معنے یہ کہ میں غلط کہتا ہوں۔"

جی نہیں میں استعجاب ظاہر کرتا ہوں کہ یہ آواز کدھر سے آئی شاید کوئی بھوت پریت ہو گیا عجب ہے"

خیر خوجی کو بتایا گیا کہ یہ آوازیں کوٹھے پر سے کسے جاتے ہیں۔ دل میں بہت ہی خوش ہوئے اور فرطِ طرب سے فرمایا۔ اگر اجازت ہو تو دو دو باتیں عرض کروں "حسن آرا نے کمرے پر سے کہا" کیا مضائقہ ہے فرمائیے۔

خواجہ بدیع الزماں صاحب نے کئی بار اس حسرت سے آزاد کے مصائب شدید کا حال بیان کیا کہ جنہیں نے سُنا بے اختیار رو دیا کبھی کبھی

ان کی جوانمردی اور بہادری کا ذکر کبھی کرتے تھے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوان گبھرو ادھیڑ بنا ہوا سامنے سے اینڈتا اکڑتا چلا آتا ہے۔ بالکل نوعمر سبزے کا نام نہیں۔ گورے گورے گال اور مستانہ چال۔ گھٹنا چست فالسائی گرنٹ کا چوڑی دار۔ جالی لوٹے کا کرتا سپر شربتی کا انگرکھا کٹا دکا۔ سر پہ بانکی پگیا گلابی رنگی ہوئی۔ ہاتھ میں کٹار۔

وہ نوعمر گبھرو خوجی کے قریب آیا تو یہ چکرائے کہ اس باغ میں اس کا گذر کیونکر ہوا اور طرہ یہ کہ انکے پیچھے پیچھے ایک بیگم۔ خواجہ صاحب اس جوان رعنا سے یوں ہمکلام ہوئے۔

" سنو بھئی جوان ہم تم دونوں سپاہی پیشہ ہیں "

" وحشت سے " کہکر جوان اکڑتے ہوئے آگے بڑھا "

خوجی نے آگے بڑھ کر کہا " اجی حضرت آخر آپ کون صاحب ہیں پرائے زنانے میں گھسے جاتے ہو یہ ماجرا کیا ہے "

" قضا کا نوحہ خواں ہے۔ کیا شامت آئی ہے "

" سنئے بندہ پرور ہم اور آپ دونو ایک ہی پیشے کے آدمی ہیں اور دونو یا ہمیں اور تم سن۔

" اگر ایکی پو لوکے تو ہم بیشک کٹار ماریں گے۔ ہم حسن آرا بیگم کے عاشق زار ہیں اور انکے دام محبت میں گرفتار سنا ہے کہ آزاد نامے ایک عیار مکار یہاں آنکر حسن آرا کے پاس پیغام نکاح بھیجنے والا ہے۔ اسی کے انسداد کے لیئے آئے ہیں۔

" آزاد کے مقابلہ میں آپ ایک ادنی لونڈے ہیں اور اس خیال خام سے درگذریئے وہ بڑا صاحب سیف سورما تلوار یا ہے اور آپ ابھی بچے اور صاحبزادے ہیں "

خواجہ صاحب بہت چکرائے۔ سوچے کہ اگر اس سے جھگڑا پڑتا ہوں تو جان جائے گی۔ اسکے پاس کٹار ہے اور یہاں قردلی منزلوں دور اور اگر خاموش رہتا ہوں تو یہ سب ٹھاٹ تو نہیں۔ مجھے عورت سے بدتر سمجھیں گے۔ تو تھم تو کر کے سمجھایا کہ بھئی گھبرو دبائیں سن لو تو آگے بڑھو۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ اس نے بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا " ابھی اسی دم حسن آرا بیگم کو بلاؤ ورنہ کٹار مار دوں گا۔

" ہائیں۔ ہائیں" خوجی بولے" این عورت دشمامرد بیاید من "

" کیوں تیری ہڈیاں پھڑپھڑاتی ہیں اے بوڑھے " جوان نے کہا۔

" کیا آپ مجھ سے زیادہ جوان ہیں۔ آپ ہیں کیا۔

" اچھا پھر پہلے تمہارا ہی کام تمام کروں ایک پہرے والے کو تو شہید کر آیا ہوں اب تمہاری باری ہے۔

خوجی پینترے بدلنے لگے اور کہنے لگے" ہم کسی سے دبنے والے نہیں ہیں"۔ خواجہ صاحب پینترے بدلتے اور بڑھتے تو جانتے تھے مگر دو باتوں سے غافل نہ تھے۔ ایک تو پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور دوسرے بھاگنے کا راستہ تجویز رہے تھے۔

جوان نے کہا" آج ہی دن تیری قضا کا تھا"

خوجی پیچھے ہٹ کر بولے" دیکھا نہیں ہے کسی کو۔ کیا مجال۔"

جوان بولا " کوئی سپاہی ہو تو اس سے مقابلہ کیا جائے تم ایسوں سے کیا مقابلہ کروں۔ مگر بھلا یا ہوں اچھالے ایک چرکا " اور جوان نے ہاتھ بڑھا کر کہا " لے بچ نکل "

خوجی چونک کر پیچھے ہٹے تو گھبرا کے گرے اور گرتے ہی آواز دی " اُف

برادر بابائے من بدیعا اندر خواب کشتا قرولی بیار۔ این گیدی بر سر پیکار
و مِن بدیعا زار زار۔

اب تو سب کو معلوم ہی تھا کہ جانی بیگم مرد کے بھیس میں آئی ہیں اور
بہار اللہ یا ان کے ساتھ ہیں یوں ہی سب کی سب بے اختیار ہو ہو ہنس رہی
تھیں مگر ان کے گرنے سے وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ الاماں الاماں۔

اب خواجہ صاحب کی سُنئے کہ گرے تو اُٹھتے ہی نہیں جوان نے للکارا
"بس اسی برتے پر بھولا تھا۔ اے پھٹکار۔

"من بدیع دنگلے والی پلٹن کا رسالدار نگرسہ مردمی نہ بود فتادہ را
پائے زدن + گر دست فتادہٴ بگیر مردے "

اتنے میں ایک مہری بھی خوجی کے پاس آگئی۔ خواجہ صاحب چاروں
شانے چت پڑے ہوئے ہیں آنکھیں کھول کھول کر اس جوان رعنا کو دیکھتے
جاتے اور سمجھتے تھے کہ خدا نے اس کو ملک الموت کی صورت میں بھیجا ہے۔ مگر
ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم اور وہ جوان زیبا شمائل رعنا خصائل برابر یہی
کہہ رہا تھا "یہ ان کے ذریات سے ہیں حسب سند ہے کہ آزاد کو ڈپٹ لوں
ممکن کیا کہ ہماری بغل میں حسن آرا انھوں "

"واللہ" خوجی بولے "میں اسوقت اپنے زعم میں اپنے آپ آرہا "
مہری نے پھبتی ماری "اسمیں کون کلام ہے میاں ایسا ہی ہوا "
"اور اب بھی اگر اٹھوں تو قیامت بپا کر دوں "

"اے نہیں آپ کے دشمن اٹھیں" مہری بولی "ایسی آرام کی جگہ پا کر کوئی
چھوڑتا ہے۔ مگر گرے بھی اس زور سے کہ زمین ہل گئی۔ اے میں سمجھی کہ
بھونچال آگیا۔ ماشاءاللہ جوان بھی گراں ڈیل ہیں۔ زمین کا کلیجہ تک

دہل گیا اب جس وقت اٹھیں گے زمین اور بھی دب جائے گی"

جوان نے کہا "کل ہم دریافت کر لیں کہ آزاد ٹکے کہاں ہیں تو وہیں پہونچیں اسی دم جاؤں اور للکاروں اور ڈانٹ بتاؤں"

"واہ گھر کی ٹکی اور باسی ساگ" خوجی نے کہا۔

"کیا! کیا آزاد ہم سے بڑھ کر تلوار یے ہیں"

"بہتوں کا ارمان نکل گیا صورت دیکھتا تو رستم بھاگ جاتا"

"اچھا پھر کل سہی۔ دیکھو تو ہوتا کیا ہے"

خوجی نے کروٹ بدلی۔ جوان نے کٹار دکھا کر کہا "یہ کروٹ بدلنا گیا معنے چت ہو۔ اور ٹھنٹے ایسے مرنے میں آئے۔ اوپچی کلے پر کھڑا ہے اور انکو آرام و آسائش کی سوجھتی ہے۔ کیا بے تکلف آدمی ہیں"

"دیکھو بی مہری" خوجی بولے "اس وقت ناحق کا خون ہماری گردن پر ہوگا سچ کہتا ہوں۔ اس وقت ایک آدھ کا خون ہوا ہی چاہتا ہے"

"اے نجچے ڈر موے پھر ٹہ آکے گر پڑا۔ مردوے کی صورت دیکھتے ہی اور چلا ہے باتیں بنانے"

جوان نے کہا اس پہ کیا فرض ہے جس کو ہم ڈانٹ دیں گے وہ رعب میں آجائے گا۔

"اب کل معلوم ہو گا کل ساری قلعی کھل جائے گی میاں صاحب میں تو خیر اس وقت اپنے زعم میں اپنے آپ منھ کے بھل گر پڑا!"

مہری نے کہا "اے تو اب اٹھو گے بھی یا یہیں دفنائے جاؤ گے"

بہار النسا بیگم اس جوان رعنا کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لیگئی تو خوجی بالے غصے کے اٹھے اور خدا حافظ کہہ کر چلے دل میں سوچتے جاتے تھے کہ آزاد سے

جا کے کہوں گا کہ حسن آرا کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ چشمے کی طرف سے ہوٹل کی راہ لی۔ گرتے پڑتے ہوٹل میں داخل ہوئے اور آزاد کو دیکھتے ہی منھ بنا کے سامنے کھڑے ہوئے۔

آزاد نے مصرع پڑھا "خیر مقدم چہ خبر یار کجا راہ کدام"

"ہونھ"

"کیا۔ خدا خیر کرے۔ ارے میاں گئے تھے وہاں؟"

"ہونھ"

"یا الٰہی کچھ منھ سے بھی تو بولو میاں"

"گھڑی دو میں مر لیا باجے گی"

"کیا۔ اسکے معنے کیا۔ جنون ہو گیا ہے گیا؟"

"بس گھڑی دو میں مر لیا باجے گی"

"حسن آرا بیگم کے یہاں گئے تھے کسی سے ملاقات ہوئی۔ کیا رنگ ڈھنگ ہے۔ تم مخبوط الحواس معلوم ہوتے ہو"

"وہاں گئے نہیں تھے تو کیا جہنم میں گئے تھے۔ نہ جانہ کیا معنے۔ جائیں اور بیچ کھیت جائیں۔ مگر......"

"اگر مگر کو تو رہنے دو صاف صاف بتاؤ"

"اس سے زیادہ صاف اور کیا ہوگا"

"بھائی صاحب ہم نہیں سمجھے اور ہمیں الجھن ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ کے لئے طبیعت پریشان کرنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ"

"از رقیبان حذر ے کن بابائے من بدیع۔

"رقیبان کیا! یہ بکتا کیا ہے"

"بکتا نہیں ہوں سچ کہتا ہوں۔ گھڑی دو میں مر لیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مر لیا باجے گی"

آزاد نے جھلا کر کہا "خوجی اگر صاف صاف نہ بیان کرو گے تو اس وقت بہت بری ٹھہرے گی۔ بس اب تم کو اختیار ہے"

"اور اُلٹے مجھی کو ڈپٹتے ہو۔ میں نے کیا بگاڑا"

"وہاں کا مفصّل حال کیوں نہیں بیان کرتے"

"کیا بیان کروں حسن آرا بیگم سے باتیں ہوئیں گھنٹوں آپ کا ذکر خیر رہا۔ اینجانب آپ جانتے ہیں ایک لسّان آدمی ہیں جو شاعرانہ تقریر کی تو وہ سماں باندھا کہ حسن آرا بیگم اور ان کی ہمجولیاں آٹھ آٹھ آنسو روئیں اور پھر ایک لطیفہ ایسا کہہ دیا کہ قہقہے پڑنے لگے مس میڈا اور مس کلیرا اور پولینڈ کی شہزادی اور گڑی اور گیلی اور سبز پوش سب کے عشق کا حال بیان کیا۔ اور آپ کی پاکدامنی کا ثبوت دیا پورا پورا پھر تو یہ کیفیت تھی کہ جتنی بیٹھی تھیں دل میں سب کی یہی خواہش تھی کہ آزاد ہمارے میاں ہوں تو بڑا لطف ہے۔"

"یہ کیا واہیات گفتگو ہے۔ پرائی بہو بیٹی کی نسبت ایسی بات زبان سے نکالنا پاجی پن ہے"

"اجی ہم تو باتوں سے اشاروں سے تاڑتے ہیں"

"اس وحشت کے صدقے۔ یہ گھڑی دو میں مر لیا باجے گی۔ اس کی خبر نہ نکلی۔ عجب بے تکے ہو واللہ۔"

"سنتے جائیے۔ میں نے آپ کا مفصّل حال بیان کیا تو سب کی سب خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ رجب علی بیگ سرور اور خواجہ امان سے بھی خواجہ بدیع بڑھ گئے۔ تو بیاں سے بھی بڑھے چڑھے ہیں۔ صورت تو کسی کی میں نے

دیکھی نہیں مگر آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ انتہا کی حسینہ وجمیلہ ہیں اور سب
شوخ و شنگ چلبلی "

اس کے بعد خواجہ صاحب نے پھر منہ بنایا اور بکمال فصاحت اور
بلاغت اس واقعہ کا حال یوں کہہ سنایا "ناقلان نقل الم وحاکیان حکایت غم
تابوت قرطاس میں بعض مضمون کو یوں رکھتے ہیں کہ اندرین زمانہ یگانہ رنج
کاشانہ میں ایک مرد خدا عارف باللہ شرافت ونجابت دستگاہ معروف
ومشہور جہان سحبان گیہان نامی خواجہ بدیع الزماں کہ شاعر اچھا اور منشی
بہت اچھا تھا ایک پری کے باغ میں داخل شد "

آزاد نے جو یہ بے تکی ہانک سنی تو ان کو اور بھی الجھن ہوئی کہا "از برائے
خدا مختصر طور پر کہو معلوم ہے کہ آپ سرور مغفور سے بھی اس فن میں بڑھ گئے
مگر نثاری کی لیاقت کے اظہار کا یہ کون موقع ہے "

خواجہ صاحب نے بگڑ کے کہا "یاروں کی تو یہی تقریر مسلسل ہے جس کا
جی چاہے سنے خواہ نہ سنے " یہ کہکر اپنی کہانی کا سلسلہ یوں شروع کیا
"اس باغ رشک راغ میں پراز بلبل و زاغ "

"خدا کی مار اس بھونڈی تک بندی پر "

"بس قبلہ اگر کل قصہ سننا ہے تو ٹوکئے نہیں اگر ایکی ٹوکا تو واللہ
نہ کہوں گا - ذرا دل لگا کر سنئے . اس باغ رشک راغ پر از مینا و زاغ
میں ایک چمپئی رنگ نرگسی آنکھوں والی متوالی کہ حسن میں یوسف مصری سے
خراج لینے والی تھی چھماں چھماں خراماں خراماں نظر آئی دیکھتے ہی میں نے کہا دہائی
فریادرس آلہی جسن اتفاق سے لونڈوں نے جو مجھے اس گلبدن پاکدامن پر لٹو
دیکھا تو تک بندی کے ساتھ آوازے کسنے اور پھبتیاں کہنے لگے تکرار اور

طبیعت داری اور غُل کی آواز سے وہ خفتہ چار بالش ناز سراپا انداز بیدار ہو گئی"
" اس بے تکے پن کے قربان۔ کہاں تو چہاں چہاں خراماں خراماں کہا تھا
کہاں خرابہ ناز کا ذکر ہے۔ واہ"

"کیا عجیب آدمی ہو، آپ ہی چمن میں خرام کر رہی تھی۔ مگر نرگسی مست من
بدلیعاد دیکھتے ہی آنکھ لگ گئی۔ خیر اب سُنئے کہ اس نسرین بدن کے جلو میں ہزار ہا
پریاں کوہ قاف کی تھیں مگر تھوڑی ہی دیر میں ایک جوان کٹار کف سامنے آیا
اور مجھے للکارا تو اپنے زعم میں اینجانب اپنے آپ ہی گر پڑے"

آزاد بہت خفا ہو کر بولے "تمہاری ان ہی پاجی پن کی باتوں پر ہمیں
غصہ آتا ہے۔ بس۔ بھلا دل دگی اور فقرہ بازی اور تک بندی کا یہ موقع
کون ہے۔ مگر کہے اس سے جو سمجھے"

"اجی جناب صاف صاف یہ ہے کہ حسن آرا بیگم کے ایک اور چاہنے
والے پیدا ہوئے ہیں اور ان کی زنان خانے تک رسائی ہے۔ باغ میں
بندہ بیٹھا تھا اور باغ کے بنگلے میں حسن آرا بیگم اور ان کی بہنیں اور بیگمات
اور خواصیں بس۔ ایک جوان سامنے سے نمودار ہوا اور مجھے دیکھتے ہی آگ ہو گیا۔

"کوئی خوبصورت آدمی ہے کمسن ہے ؟"

"نہایت حسین اور ابھی بالکل کمسن ہے بس بہت ہو تو پندرہ سولہ
برس کا سن ہو۔ بس اس سے زیادہ نہیں ہے"

"اور ہاتھ پاؤں کیسے ہیں"۔ "ڈنڈ بیل جوان ہے یا ڈبلا پتلا۔ وہاں کیا
کرنے آیا"

"بہت ہی نازک اندام پتلی کمر اے بالکل ہی بچہ ہے۔ کا ہی بھی نہیں

حلوان سمجھئے۔ اس نے کہا بھلا آزاد بیچارے کیا ہیں اور کل ہی تو اُن سے

کھڑے کھڑے سمجھ لوں گا میری موجودگی میں حسن آرا بیگم پر کوئی نظر ڈالے کیا طاقت یہ کہکر ذرا نا بنگلے میں چلا گیا جہاں وہ سب بیٹھی ہوئی تھیں "

"اس میں کچھ بھید ہے ضرور۔ تمہارے اُلّو بنانے کے لیے شاید دل لگی کی ہو۔ مگر ہمیں اس کا یقین نہیں آتا "

"یقین تو ہمیں مرتے دم تک نہ آتا مگر وہاں تو قہقہے پڑ رہے تھے۔ اس جوان خوبرو کے دیکھتے ہی بنگلے سے قہقہے کی آوازیں آنے لگیں اور جب میں اپنے زعم میں آ رہا تو اور بھی قہقہہ پڑا۔ اس سے تو بھائی جان میں بہت کھٹکا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے ورنہ نامحرم کو دیکھکر قہقہہ کیسا "

خواجہ صاحب نے قسم کھا کر اور آزاد کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "آزاد اس سر کی قسم کھا کے کہتا ہوں اور خدا اور خدا کا رسول گواہ ہے کہ بنگلے سے بیگمات نے قہقہہ لگایا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور مجھے یقین واثق ہو گیا کہ اس حسین جوان کی یہاں بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ورنہ غور تو کیجئے بھلا نامحرم کسی شریف زادی کے زنانے میں بیدھڑک جا سکتا ہے اور ہاں خوب یاد آیا یہ تو کہنا بھول ہی گیا تھا کہ ان کے پیچھے پیچھے ایک نہایت کم سن طرحدار نواب زادی تھیں خوب بنی ٹھنی۔ بڑے ٹھسے پہلے تو اس جوان کو دیکھ کر بہت ہی اُچھلی کودیں اور غل مچایا اور مجھے للکارا کہ تم کیسے مردوے ہو کہ ان کو منع نہیں کرتے۔ یہ پرائے زنانے میں کہاں گھس آئے ہیں اور پھر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر زینے پر لے گئیں وہ بھی بنگلے کی چھت پر داخل ہو گئیں۔ اور جوان کو بھی لیتی گئیں "

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے سر و پا کہانی کے کیا معنے ہیں۔ مگر خیر انشاءاللہ فیصلہ ہو جائے گا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی "

"اور اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ آج ضرور آؤں گا اور آزاد کو للکاروں گا کہ اس خیال خام سے در گذرو ورنہ تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا"

"خیر آنے دیجئے۔ بہت ہی خوش ہو کر جائیں گے"

"ہوں گھڑی دو میں مرلیا باجے گی"

"اخاہ۔ یہ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ کا یہ مطلب تھا یہ کہئے مگر اب تک ہم کو یہ سب خواب خیال ہی معلوم ہوتا ہے خیر سمجھا جائے گا اب تو ہم کھانا کھانے جاتے ہیں"

یہ کہکر آزاد طعام لذیذ و نفیس توشجان کرنے گئے اور خواجہ صاحب نے ایک سرا میں جا کر کھانا کھایا۔

آزاد کھانا کھا کر بیٹھے سوچ رہے تھے کہ آخر واقعہ کیا تھا کہ پیر مرد ہوٹل میں آئے اور ان سے باتوں میں سب کچھ معلوم ہوگیا۔

(۱۰)

میاں آزاد کی شادی خانہ آبادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سمدھیانے میں بھی خوجی مہتمم اعلیٰ تھے۔ آنحضرت نے پرانے فیشن کی زربفت کی چپکن زیب بدن کی دستہ لگا ہوا جیب کٹی ہوئی قیمتی بیل ٹکی ہوئی سر پر حضور نے ایک بہت بڑا شملہ رکھا گلبدن کا پائجامہ۔ کاندھے پر کشمیر کا سبز رنگ دو شالہ پاؤں میں روپہلی گھیتلا جو تا سات روپے کی اوڈگی۔ ہاتھ میں سیاہ جریب یہ کپڑے پہنکر اپنے کمرے سے باہر آئے تو لوگوں نے تالیاں بجائیں اور خواجہ صاحب بہت ہی خفا ہو کر بولے کہ "واہ ہمیں تالیاں نہیں بجاتے ہو یہ اپنے باپ دادا پر تالیاں بجاتے ہو۔ یہ خاص ان کی وضع ہے

ایک صاحب نے ہنستے ہنستے کہا "خداوندا یہ شملہ تو بہت ہی چھوٹا ہے۔ ذرا اس سے بڑا شملہ سر پہ رکھ لیجئے۔ فرمایا: سُنا نہیں شملہ بمقدار علم، مگر علم کی مقدار کا شملہ کس کے گھر سے آئے لہذا ہم نے اسی پر قناعت کی"

خواجہ صاحب قلم دوات کاغذ دست مبارک میں لئے ہوئے جلوس کی فہرست لکھنے لگے۔ مگر غلبۂ ذکاوت سے اُلٹا پلٹا فیل کے لئے "اسپ راس فیل بلکہ اقبال از سطیع نواب نوازلیش لکھا۔ اب گھوڑے قلمبند کرنے لگے "ہشت عدد اسپ" سانڈنیوں کو عجب ٹھاٹھ سے لکھا "پنج از شتر بعیران" خواجہ صاحب نے فہرست کی تمہید میں یہ کھینچکر ابتدائی سطر یوں لکھی: "فہرست جملہ اس باب برائے ہاں جہاں مکرمہ معظمہ نوابہ بڑی بیگم صاحب بعافیت باشند کہ دریں فہرست اقبال و گھوڑے بعیران و مردمان واثاثیان ہمہ حسب ذیل درج نمودہ شدہ است"

اب مانجھے کا سامان باہر آیا۔ خواجہ صاحب "شرف ہر دوا" کہتے ہوئے اس طرف سے مصروف انتظام تھے اور اس طرح دل سے انتظام میں مشغول کہ کسی کی سنتے ہی نہ تھے۔ اپنے کام میں بالکل محو تھے یعنی مستعدی سے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے اور کہتے "ہاتھیوں کو اس جانب رکھیئے و خبردار"۔ "ہاتھی ادھر بٹھالاؤ۔ فوراً" "وہیل بھی لین میں ہاتھی لگاؤ لاکے۔ تم بھی لاؤ" "دیکھو کچھ گڑبڑ نہ ہونے پائے خبردار یارو"

اتنے میں کسی نے کہا "خواجہ صاحب کیا انتظام ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ واہ جی واہ۔ اے لاحول"

خوجی آگ بھبوکا ہو کر بولے "کیا کہا" اور اکڑ کر کہنے لگے "منہ پر کوئی کہے تو دیکھیں اتنی تو ریاں کھبو کوں کہ یاد کرے"

کچھ لوگوں نے اور آوازے کسے خواجہ صاحب سمجھے کہ سب کے سب میرے مدّاح ہیں بہت ہی مسرور و محظوظ ہوئے اور اکڑ کر کہنے لگے "بابائے من بدیع بندہ فارسی گویا اُردو نگوید کہ اُردو از پوچ است و فارسی بہتر ازاں گفتہ اند ہ اسپ لاغر میاں بکار آید + روز میدان نہ گاؤ پرواری جلسہ شادی آزاد ہے۔ لہذا کام کی کثرت ورنہ آج اس وقت سے فارسی بولتا تو دس دن تک برابر فارسی ہی بولتا جاتا اور کون فارسی لٹیا فرستاد وصولی نرسید نہیں۔ تم کی فارسی اور قصیدہ تو آزاد کی شادی کا کہنا شروع کیا ہے۔ مطلع سُنئے۔ شادی زوجہ خوش بخت مبارک باشاد + مبارک سلامت مبارک باشاد۔ گلے سے بھی کہتا ہوں۔ بین کار ہوں اور شاعر بھی ہوں۔ اتنے کمال جناب باری نے مجھ نا چیز میں عطا کئے ہیں"

الغرض نہایت تزک و احتشام اور بڑی دھوم دھام سے مانجھا خانہ طرب کاشانہ میں پہونچا۔

پانچ دن کے بعد ساچق کی تیاری ہوئی۔ چاندی کا پٹارا باہر آیا۔ چھوٹی شیشیاں۔ عطر کی شیشیاں۔ کیوڑے گلاب کے کنٹر یہ سب اس میں قرینہ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب بار بار پٹارے کا ڈھکنا اُٹھا کر دیکھتے تھے اور کہتے کہ خبردار شیشیاں نہ گرنے پائیں۔ موتیے کا عطر خدا جانے کن دقتوں سے لایا ہوں۔ یہ وہ عطر ہے جو آصف الدولہ بہادر کے ہاں سے بادشاہ بیگم کے لیے گیا تھا"

کسی نے پوچھا "الحمد اللہ یہ تو پرانا عطر ہے حضور کو کہاں سے مل گیا"

[illegible] جی نے جواب دیا کہاں سے مل گیا یہاں کہاں سے جاتا

جو بندہ یا بندہ - یہ شاہی کوٹھوں کی چیزیں بڑی تلاش سے ملتی ہیں۔
ان صاحب کے مُنھ نکلا "یہ برسوں کا عطر چکٹ نہ گیا ہوگا"
خوجی بولے "ہو نھ" عقل بڑی کہ بھینس۔ یہ وہی مثل ہوئی ابے گیدی بادشاہی کوٹھوں کے عطر کہیں چکٹا کرتے ہیں یہ بھی ان گندھیوں کا تیل ہوا جو بیلا چمیلی مسی پھلیل کہتے پھرتے ہیں۔ یہ عطر وہی ہے جو خاص بادشاہ بیگم کے لیے آصف الدولہ کے وہاں سے ساچق کے دن بھیجا گیا تھا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اسی وقت پھولوں کو توڑ کر عطر کھینچا ہے عجیب بو باس ہے واہ رے موتیے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تختہ کھل گیا جونپور اور قنوج دونوں کو گرد برد کر ڈالا"

الغرض جلوس قرینے سے آراستہ ہو کر چلا۔ خوجی ادھر ادھر اُچکتے پھرتے تھے۔ پنشاخے والیوں سے اور اُن سے خوب چھوڑ ہوتی تھی۔ ایک پنشاخے والی کا ہاتھ پکڑا اور کہا "دوڑ ہمارے ساتھ"
وہ بولی "دُر موئے ڈاڑھی جھلس دونگی ہاں"۔ آیا دہاں سے برات کا داروغہ بن کے موا بونا سوائے وہی مرُمٹے پن کے دوسری بات نہیں"
خواجہ صاحب تیش کھا کر اور بگڑ کر گالیاں دینے لگے۔ پنشاخے والی نے بھی خوب جواب دیئے۔ آخر لوگوں نے آگر تتو تھمبو کی۔
ساچق دلھن کے یہاں پہونچ گئی۔

دوسرے دن دلھن کی طرف سے مہندی کا اہتمام ہوا۔ بارہ ۱۲ بجے شب کو مہندی روانہ ہوئی خواجہ بدیع الزماں بدیع نے للکارنا شروع کیا "لال مہتابیں روشن رکھو تاکہ چوک میں ادھر ادھر کم و بیش جھمکڑا نظر آئے روشنی ایسی ہو کہ دن کو مات کر دے۔ روز روشن گرد برد ہو جائے۔

پیشانی چڑھاؤ۔ پیشانی والے بڑھاؤ۔ باجے بجاؤ گھوڑوں کو چمکاؤ۔ ہاتھی ڈٹاؤ۔ مگر اس پیشانی والی کو نہ آنے دینا خبردار کہہ دیا ہے۔ مگر آج آئی تو کوچے ہی کاٹ ڈالوں گا اس روز اس کی موت نہ تھی ورنہ دم کے دم میں قتل کر ڈالتا۔ او مشعلچی ادھر مشعل لا۔ ادھر دکھا۔ دیکھو ہر سواری کے ساتھ دو دو ایک ایک پیشانی والی رہیں۔ ہوادار کے ساتھ ایک اِدھر ایک اُدھر مگر گھوڑوں کے ہمراہ دو دو اِدھر اور دو دو اُدھر چار چار مشعلچی آگ لگا دو بازار میں سب جھکا ہوا نظر آئے۔ لالہ زار چراغاں کی چکاچوند ہو۔ اور جسقدر سائیس ہیں سب کو تاکید کیجاتی ہے کہ فوراً اور معاً گھوڑوں کو چمکائیں اور ہر مقام پر گھوڑے چالاکیاں دکھائیں اور فیلبانوں کو حکم دو کہ وہ ہاتھیوں کو ذرا آتشبازی کے پاس لیجائیں جس میں خوب جھڑکیں۔ لوگوں نے بتایا کہ اگر ہاتھی بھڑکیں گے تو سیکڑوں کا خون کرینگے۔

خوجی بولے کچھ پرواہ نہیں دُم پکڑ لوں تو ہمّت نہ سکیں۔ ایک کی دُم اور ایک کی سونڈ اور باقی کو ڈانٹ بتائی بھلا بے بھلا خبردار جو آگے بڑھا۔ خبردار بس۔ مجال کیا کہ بڑھ سکے اور کیا۔ چنگھاڑ کے منہ کے بل بھاگے۔

غرض جھنڈی میاں آزاد کے ایوان میں پہونچی جھنڈی کی رسم بڑی بیگم کی خاطر خواہ بڑی دھوم سے انجام کو پہونچی اور اب برات کے دن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مگر برات سے قبل دولھا کے یہاں شہر کے سب مولوی جمع ہوئے۔ سب نے ان کی بڑی تعریفیں کیں۔ آخر میاں آزاد نے فارسی زبان میں نہایت عمدہ تقریر کی۔

خوجی نے جو دیکھا کہ آزاد کی چوطرفہ تعریف ہوتی ہے اور ہمیں ح کسی نہی

پرسد کہ بھیا کون ہے۔ تو بہت ہی جھلّائے۔ اور کل شہر کے ایمیونکو جمع کر کے

انھوں نے بھی جلسہ منعقد کیا اور نظم میں ایک طویل تقریر فرمائی اور اسکے بعد نثر میں یوں فرمانے لگے۔

"بعد حمد بیچوں اما بعد بہ میگویداسعدک اللہ تعالےٰ فی الدارین کہ معشوقہ جہر سیتیم برائے وزن بیت کم خم بی چنیا بیگم زد عفتہا وہ محبوبہ سیہ تاب و سنبل رو کھیا آبرو وہ ہیں کہ اگر سن پدلیا ہزار بار جی کو مرے تو بھی ایسی دلھن نہ ملے اس پریپرہ میں اسقدر اوصاف ہیں کہ بس گو مگو کا معاملہ ہے۔ ایک صفت ہو تو بیان کروں دو صفتیں ہوں عرض کی جائیں تین صفتیں ہوں تو کہہ چلوں بہار صفتیں ہوں تو معرض بیان میں لاؤں جب اسقدر صفات حمیدہ ہوں جس قدر ریت کے ریزے اور آسمان کے تارے اور دنیا بھر کے آدمیوں کے سر کے بال اور درختوں کے برگ نہال کی چھال اور پانی کے حباب اور شعاع آفتاب تو پھر حیز بیان سے خارج اور حیطۂ التماس سے باہر کیونکر ہو چنیا بیگم کو خدا بخشے انکا دم بھی غنیمت ہے اور لطف یہ کہ ایک یہ اور ہزاروں بلکہ لاکھوں۔ اے توبہ حضرت کروروں آشنا جسے دیکھئے چنیا بیگم کا عاشق زار۔ اس لیلی سیاہ فام پر دل وجان سے نثار ہے جو ہے اسی کی بلائیں لیتا ہے اور دعائیں دیتا ہے۔ ایسی پیاری معشوقہ دیکھی نہ سنی۔ سانولی رنگت سیاہی ہر عضو سی جھلک رہی ہے اور کروڑ حسن کا ایک حسن تو یہ ہے کہ اینجانب کی زوجہ مکرمہ ہیں۔

سامعین نے آفریں آفریں۔ مرحبا مرحبا کی صدا بلند کی خواجہ صاحب کی بڑی تعریف کی۔ ایک افیمی نے کہا "اجی سب کے سب افیمی ہو جائیں تو سبھی وہ کام کیا ہے انھوں نے" دوسرے نے کہا "مگر ایک خرابی ہوگی افیم مہنگی ہو جائے گی۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اپنی تقریر یوں جاری رکھی کہ سب افیمی

اس شخص نے ایک اعتراض مابدولت واقبال پر کیا ہے کہ افیم ہمارے سبب سے گراں بکیگی۔ اکثر افیم دوست بزرگوں نے اس کا جواب دیا مگر علمی جواب نہ تھا۔ اب علمی جواب ہم سے سُنو۔ اس کے کلام لب لباب یہ ہے کہ جب لوگ کثرت سے افیون کے شائق ہونگے تو گراں بکنے لگے گی جس شئے مانگ زیادہ ہوتی ہے وہ گراں بکتی ہے سَلمنا یعنی تسلیم کیا ہم نے اس بات کو مگر کیا خاصہ جواب ہے۔ جواب یہ ہے کہ سب سے زیادہ ضرورت دنیا میں غلّے کی ہے غلّہ کیا یعنی گیہوں گندم اور چاول برنج اور دال از قسم خورش اور گوشت لحم اور ترکاری بقولات اور چنا نخود اور پونڈا یا گنا نیشکر۔

"دنیا میں جسقدر ضرورت غلّہ کی ہے اسقدر کسی شئے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر فروخت اور مانگ کی کثرت سے اشیا گراں ہوجائیں تو غلّہ بھی ابتک گراں ہوجاتا مگر اسقدر ارزاں ہے کہ جولاہے اور تیلی اور خاکروب اور کوری اور چمار سب خریدتے اور کھاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ غلّہ کی ضرورت زیادہ ہے تو غلّہ زیادہ بونے لگے جب غلّہ زیادہ بویا گیا تو ارزاں ہوگیا۔ اسی طرح جب افیم کی خواہش ہوگی تو غلّے کے مثل بوئی جائے گی اور سستی ملے گی۔

سامعین نے اعجاز اعجاز کی آوازیں بلند کیں اور جس شخص نے یہ خرابی بیان کی تھی کہ افیم گراں ہوجائیگی اسکو لوگوں نے ذلیل کرنا شروع کیا اس نے مجبور ہوکر خواجہ صاحب کے ہاتھ جوڑے اور معافی مانگی۔

خواجہ صاحب پھر رطب اللسان ہوئے "یہ جس شخص اسقدر منت وسماجت اور گریہ وزاری اور فروتنی اور انکسار کے ساتھ میری درگاہ میں کہ میں اس کا خداوند ہوں پیش ہوا یا تو میں نے اسکو معاف کیا

گو کہ میں وہ شخص ہوں کہ اگر اپنے لیے مایۂ دولت و اقبال کا جملہ استعمال کروں تو می زیبد۔ مگر انکسار مانع ہے۔ میں تو اپنی زبان سے یہی کہوں گا میں بالکل ناچیز ہوں اور ارذل خلائق اور رو سیاہ اور بدترین مخلوقات اور اضعف العباد اور ہیچمرز اور ہیچمدان اور کج مج زبان اور ژولیدہ بیان ہوں مگر دنیا جانتی ہے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ میں اپنی زبان سے تو یہی کہونگا کہ میں بالکل حقیر ہوں مجھے مصر کے پہلوان نے اُٹھا کے دے مارا تھا اور میں جہاں گیا پٹ کے آیا گویا واقف ہے کہ خواجہ بدیع الزماں ساری خدائی کے پہلوانوں کا سرمایۂ ناز اور ذریعۂ اعزاز ہے مگر اپنی زبان سے میں کیوں کہوں میں تو یہی کہوں گا کہ بوا زعفران نام حبشن نے مجھے چیتیا لیا یہ نہ کہوں گا کہ بوا زعفران افیونی رنگ ہیں اور اس مشابہت رنگ نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اس نے جو جو سختیاں کیں سب اُٹھائیں مگر واہ رے میں اُف تک نہ کی "

اس کے بعد خواجہ صاحب نے یوں تقریر کی " اور شنیں برادران افیم دوست کہ من بدیع اگرچہ اپنی شان میں بہت کچھ کلماتِ توصیف کہہ سکتا ہے۔ مگر جب کبھی یہ کہے گا کہ بدیع کچھ کہتا یا عرض کرتا ہے تو یوں ادا کرے گا کہ من بدیع اسوقت یہ جھک مارتا ہے اور جب کبھی اپنا ذکر کرونگا تو یوں کہونگا کہ میں پاجی ہوں یعنی میں یہ چاہتا ہوں کہ میری حقارت مشہور ہو نہ کہ امارت۔ " شنیں سب برادران افیم دوست۔ سب سے بڑا ریاض اور سب سے بڑی ریاضت سب سے بڑی نفس کشی یہی ہے جس نے اپنے نفس کو مارا وہ بندۂ مقبول خدا ہے۔ اب مقام غور ہے کہ افیوں سے زیادہ بہتر ذریعہ نفس کشی کا اور کیا ہے۔ کوئی نہیں کیسا ہی سرکش اور مغرور اور متکبر آدمی کیوں نہ ہو ایک قطرہ حلق سے اترا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ اس زمانہ میں

عجز اور انکسار بڑی قیمتی اور نایاب شئے ہے ذرا اٹرائے اور گئے گذرے ذرا ٹیڑھی بات کی اور دھر لئے گئے۔ کسی کو ایک دھول لگائی اور چالان ہوگیا اور مجسٹریٹ نے معاً دس روپیہ جرمانہ کردیے یا دو مہینے کی قید سخت۔ اب بیٹھے ہوے چکّی پیس رہے ہیں چکیا گھمر گھمر۔

سامعین نے ان کی ظرافت کی تعریف کی اور عرض کی" حضور کی زبان سے اوصاف و محاسن معشوقہ پری چہم بی چنیا بیگم سننا چاہتے ہیں اگر تکلیف فرماکر حضور پرنور کچھ فرمائیں تو زہے نصیب"

خوجی نے کہا" میں فرط انکسار سے اپنے کو اس خطاب کے قابل نہیں سمجھتا کہ آپ میری نسبت فرمائیں کا لفظ استعمال کریں مگر ہاں یوں کہئے کہ تو جھک مارتا ہے۔

سامعین کی آوازیں آئیں" تو جھک مار۔ اللہ رے انکسار۔

خوجی اکڑ کر تقریر فرمانے لگے" میں وہ مرد شیر دل ہوں جس نے میدان وغا یعنی رن کی زمین میں کروروں کو نیچا دکھایا اور لاکھوں کو خانماں خراب کیا اور پدموں کے سر اسطرح سے تن سے اُڑا دیے جیسے بھُٹّا"

پھر سامعین نے تعریفوں کے پل باندھے۔

خوجی نے تقریر پھر شروع کی" نابابا۔ ثنای من مگو من بدیع کہ از ہمہ ہر یعنی از ہر ہمہ در افیون بازی یکتا ہستم مگر میدانم کہ بندہ حقیر است اگرچہ در ملک مصر کہ منسوب بہ پہلوانان است ہمہ مردمان آنجا خوب منظر پہلوانان ہستند بندہ در ہوٹل پہلوانے را۔ مگر تم لوگ تو فارسی سمجھتے ہی نہیں مطلب یہ کہ مصر وہ ملک ہے جہاں سب پہلوان ہی پہلوان بستے ہیں۔ مگر اتفاق سے میں نے ان سب کے اُستاد کو اُٹھا کے دے مارا۔ میں آپ جانیئے۔ بڑا!

اُستاد اکھاڑے میں جیسے ہی وہ آیا میں خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دیو میں مرا ہوا آدمی ؟"

سامعین نے عجز و انکسار کی تعریف کی۔

پھر خوجی نے کہا "ہم اور اور افیمیوں میں فرق زمین اور آسمان کا ہے۔ وجہ یہ کہ ہم تو چانڈو باز زادے ہیں کیونکہ این جانب کے پدر بزرگوار سلمہ اللہ تعالے اسی نشہ کی کثرت سے راہی ملک عدم ہوئے اور دادا جان قبلہ بھی چنیا بیگم کے عاشق دلدادہ تھے۔ انکے بعد والد عاشق ہوئے ان کے بعد بندہ درگاہ۔ بھئی نقل ہے سُنیں سب مردان افیون دوست کہ ایک روز بازار نخاس میں ایک شخص بوم صفت چغد رو نے ایک چڑیمار سے ایک اُلّو کے دام پوچھے کہا آٹھ آنہ اسی کے پاس ایک اور چھوٹا اُلو بھی تھا پوچھا اس کی قیمت کیا ہے کہا ایک روپیہ تب تو گاہک نے کان کھڑے کئے اور کہا ایں اتنے بڑے اُلّو کے دام آٹھ آنے اور اس ذرا سے جانور کا مول ایک روپیہ چڑیمار نے کہا آپ تو ہیں اُلّو اتنا نہیں سمجھتے کہ اس بڑے اُلّو میں صرف یہ صفت ہے کہ یہ اُلو ہے اور اس چھوٹے میں دو صفتیں ہیں ایک یہ کہ خود اُلّو ہے دوسرے اُلّو کا پٹھا ہے۔ تو سُنیں سب برادران کہ من بدیع صرف اُلو ہی نہیں بلکہ اُلّو کا پٹھا ہے"

"اللہ رے انکسار۔ اُف رے تیری عاجزی" سامعین نے کہا۔

"جی" خوجی کہے گئے "انکسار کے یہ مدارج کوئی پا سکتا ہے لوگ فرط عجز سے اپنے کو ہیچمدان ہیچمیرز خاکسار خادم بندہ احقر ارذل خلائق اضعف لکھتے ہیں مگر بدیع اپنے کو جب لکھتا ہے اُلّو کا پٹھا لکھتا ہے"

"اس سے زیادہ انکسار خدا کا نام ہے" سامعین نے کہا۔

خوجی نے کہا "ایہا السامعین من بدیع الزماں اُلّو کے پٹھے نے جو جو کام کیا کوئی کرے تو جانیں اور جو جو مصائب برداشت کئے کوئی برداشت کرے تو ٹانگ کی راہ نکلجائیں۔ کوہستان کو ہم نے کاٹا اور بڑے بڑے پتھر اُٹھا اُٹھا کر دشمن پر پھینکے۔ ایک روز چوالیس من کا ایک پتھر ایک ہاتھ سے اُٹھا کر روسیوں پر مارا تو دو لاکھ پچیس ہزار سات سو اٹھ آدمی کچل کے مر گئے۔

"ان دُبلے ہاتھ پاؤں پر" سامعین میں سے ایک نے کہا۔

خوجی مسکرا کر بولے "کیا کہا دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں۔ یہ ہاتھ پاؤں دُبلے پتلے نہیں ہیں مگر بدن چور ہے۔ یہ بھی اللہ کی دین ہے دیکھنے میں تو معلوم ہوتا ہے مرا ہوا آدمی ہے مگر کپڑے اُتارے اور دیو معلوم ہونے لگا۔ اسی طرح میرے قد کا بھی حال ہے کہ گنوار آدمی دیکھے تو کہے پستہ قد ہے مگر اس فن کے مبصّر خوب جانتے ہیں کہ میں کس درجہ کشیدہ قامت ہوں اور روم میں۔ مجھے کہتے ہوئے ہنسی آتی ہے روم میں دو ایک گنواروں نے مجھے بھی بونا کہا تو بے اختیار ہنسی آگئی۔ یہ خدا کی دین ہے کہ ہوں میں دراز قد بالا بلند مگر کوئی کلجگ کی کھونٹی کہتا ہے کوئی بونا بتاتا ہے ہوں تو موٹا تازہ سنڈا بنا ہوا مگر جو لوگ مبصر ہیں وہ سمجھتے ہیں نازک بدن ہے۔ ہوں شریف زادہ اور خود شریف ابن شریف ابن شریف تین پشت تک کا حال معلوم ہے کہ شریف زادہ ہوں آگے پتا نہیں چلتا با ایں ہمہ شرافت جو لوگ ناواقف ہیں دیکھتے ہی کہتے ہیں کہ یہ کوئی پاجی ہے صورت سے پاجی پن برستا ہے مگر سیرت خدا نے وہ دی ہے کہ کسی شریف کے باپ کو بھی نہیں نصیب ہوئی۔ عقل اسقدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ افلاطون اگر زندہ ہوتا تو شاگردی کرتا اور لقمان

زانوئے ادب تہ کرتا۔ یونان کے حکیم جو تیاں من بدیع کی سیدھی کرتے مگر اسکی کریمی کے صدقے جو دیکھتا ہے کہتا ہے یہ شخص گدھا ہے اسکو عقل کہاں اللہ کی کیا دین ہے کہ بنایا عقل مجسم اور لوگ گدھا سمجھتے ہیں۔ اس بندہ نوازی کے قربان واہ میرے مولا۔ وہ صدقے اس بخشش کے "

خواجہ بدیع الزماں صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ اکڑ کر کہا "سنئے سب برادران افیون دوست کہ نفس کشی جس سے من بدیع نے یہ درجۂ اعلیٰ حاصل کیا کیا شئے ہے اور اسکے فوائد کسقدر ہیں۔ واضح ہو کہ نفس کشی کے یہ معنے کہ اپنے نفس کشی کرے یعنی قتل کش ماضی مطلق ہے مصدر اسکا کشیدن "

سبحان اللہ۔ آمد نامے تک پر حاوی ہیں" آواز آئی۔

" نفس کشی کے معنے نفس کا مارنا ہیں نے اس میں وہ ملکہ بہم پہونچایا ہے کہ تم لوگ سُنکر دنگ ہو جاؤ گے۔ یہ سر جو دیکھتے ہو یہ من بدیع کا سرنامبارک ہے کیونکہ میں اس سر کو گو وہ مبارک ترین سر ہے نامبارک ہی کہونگا اور یہ بھی انکسار اور نفس کشی ہے خیر یہ میرا نامبارک سر جو تم دیکھتے ہو اسپر کم سے کم سو دھولیں ٹوٹ پڑی ہونگی۔ ہزار چپتیں بھی نہ لگی ہونگی مگر قسم لو جو ذرا اُف بھی کی ہو۔

" تسلیم کی من بدیع نے یہ بات کہ دھولیں کھاتے کھاتے مشّاق ہو گئے مگر اس کا جواب کیا کہ ابتد۔ ابتدا میں تو کھوپڑی اسکی عادی نہ تھی کہ چپت گاہ بنائی جائے۔ جب اسقدر ریاض کیا اور اتنی افیم پی تب تو یہ بات حاصل ہوئی کہ اگر کوئی شخص جوتوں سے سرنامبارک من بدیع کا پیٹے تو چوں نہ کروں اور یہ درجہ ہر افیمی نہیں حاصل کر سکتا۔

" علاوہ بریں یہ بات بھی فرمانا کہ اسے حاصل ہے مگر کسی نے

گالیاں دیں تو خوش ہو گئے۔ کسی نے کہا خواجہ بدیع گدھا ہے۔ ہنسکر جواب دیا کہ صرف وہی نہیں بلکہ من بدیع کے والد بزرگوار بھی ایسے ہی تھے اور دادا جان بھی ایسے ہی تھے۔ جی یہ بات حاصل ہونی دل لگی نہیں ہے۔ کچھ اس انکسار سے من بدیع نے اپنے باپ کی روح کو بھی شاد کر دیا "

" مگر رحمدلی اور نیکی اور انکسار کے ساتھ انیجاب جری بھی پرلے سرے کے ہیں اور کیونکہ سپاہی آدمی ہوں بات کی تاب نہیں ادھر کسی نے اعتراض کیا ادھر ہم نے چانٹا جڑا۔ کسی نے ذرا ٹیڑھی بات کہی اور ہم نے سیدھا بنایا اوگیدی جاتا کدھر ہے۔ لاناقرولی۔ لاناقرابنچہ مصر کے نامی پہلوان کو مارا چاروں شانے چت۔ افیمی کمزور ہوا کرتے ہیں مگر یہ بات کسی افیمی میں دیکھی نہ سنی اور صاف یہ ہے کہ جناب والد بھی تو یوں افیم پیتے اور دن بھر چانڈو کے چھینٹے اڑایا کرتے تھے اور ساقیوں کی دکانوں پر چلمیں بھرتے تھے مگر یہ جرأت اُن کی بھی نہ تھی۔ بندہ گڑھیا میں کنول پھولا ہے ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند

" سنیں براداران افیونی دوست و شائقین مزرع پوست کہ اس زمانے میں افیمی اور چانڈو باز ہونا دلیل انسانیت ہے اسکی وجوہ موجبہ ٹمنئے

۱۔ اوّل تو چانڈو پینا بغیر اس کے کہ انسان لیٹ جائے امر محال ہے اور ظاہر ہے کہ جس شئے کی ابتداء لیٹنے کی ہو وہ انتہا کے انکسار سے مملو ہے کہ اپنے کو گرا دے اور خاک میں ملا دے ع خاک شو پیش از آنکہ خاک شوی۔ جو سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے اسکے معنے یہ ہیں کہ قبل موت کے تو چانڈو پی اور مولانا روم نے مثنوی میں بھی اس کی تعریف کی ہے ۔ بشنو از نے چوں حکایت میکند + واز جدائی ہا شکایت میکند۔ نے سے مراد ہے چانڈو کی نے سے مگر اس کا سمجھنا امر مشکل ہے صرف چانڈو باز ہی سمجھ سکتے ہیں

نہ کے ایسے ویسے عوام۔ الغرض فروتنی اس کا اوّل قنطرہ ہے۔ قنطرہ کے معنے زینہ اس قنطرہ پر چڑھے اور چانڈو کے اسرار نہانی کا مشاہدہ ہونے لگا ہے کہتے نہیں کہ بھئی فلاں شخص ایسے نیک آدمی ہیں کہ اگر اُن سے بیٹھنے کو کہو تو لیٹ جائیں بس جبکہ بغیر فروتنی کے چانڈو کا استعمال امر محال ہے تو جاننا چاہیئے کہ انکسار اور عاجزی اور فروتنی اس سے پیدا ہیں اور چونکہ یہ ہم سے پیدا ہے لہذا ثابت ہوگیا کہ خواجہ بدیع الزماں چانڈو بازوں کے قبلہ گاہ اور پشت پناہ ہیں

۲ ۔ دوسری ثنا و صفت چانڈو کی یہ ہے کہ ہر دم لو لگی رہتی ہے جس کو ہندو جاگتی جوت کہتے ہیں۔ ہر دم لمپ روشن جب دیکھو چانڈو خانہ عارفوں کے دل کی طرح جگمگاتا ہے۔

۳ ۔ افیم میں بڑی صفت یہ ہے کہ اسکی پینک میں انسان کے قریب غم و فکر آنے ہی نہیں پاتے چسکی لگائی اور غوطے میں آئے صبح تک موجیں لیتے ہیں۔

۴ ۔ افیمی شب زندہ دار بیدار گوار ہیں رات بھر نیند نہیں آتی اور یہ نعمت ہر ایک کو نہیں حاصل ہوتی۔

۵ ۔ افیمی سحر خیز ہوتے ہیں تڑکا ہوا اور آگ لینے چلے اور سحر خیز ہونا ہزار تندرستیوں کی ایک تندرستی ہے۔

۶ ۔ افیمی کی وہ غذا ہوتی ہے جو شیریں شئے ہے۔ پونڈا۔ گنا۔ کتارا۔ بالائی۔ ربڑی۔ گڑ۔ کھیر۔ فیرنی۔ میٹھے چاول۔ میٹھے ٹکڑے۔ دودھ ریوڑیاں گوشت کا چنداں شوق نہیں۔ اور اس سے رحمدلی ثابت ہوتی ہے کہ اپنے ذائقے کے لیے کسی کی جان کیوں لیں۔

۷ ۔ افیونی پرلے سرے کے بذلہ سنج ہوتے ہیں چنانچہ اسکی مختلف کہانیوں سے ظاہر ہے اب اگر کسی کو شک ہو تو بسم اللہ بیان کرے ہ

اسپر ایک پُرانے خرّانٹ افیونی نے جو سن رسیدہ اور گرگ باراں دیدہ تھا کہا "ہمیں چند امور میں شک ہے۔ اوّلاً افیمیونکی عمر کم ہوتی ہے چنانچہ جو لوگ چین گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ وہاں تیس برس سے زیادہ سن کا آدمی ہی نہیں"

خواجہ صاحب نے مسکرا کر یوں جوابدیا "اوّل تو یہی غلط ہے کہ اس ملک کے لوگ چین گئے۔ آپ لوگ بسم اللہ کے گنبد میں پڑے ہیں آپ ان باتوں کو کیا جانیں۔ ہم سیّاح جہاں دیدہ ہیں ہم سے پوچھئے تو ہم بتائیں۔ سنئے چین کے باشندے غیر ملک والوں کو اپنے ملک میں نہیں آنے دیتے۔ لہذا قول قائل غلط ہو گیا۔ پھر یہ بھی غلط ہے کہ چین کے باشندے تیس برس کی عمر میں مرجاتے ہیں۔ میں مورّخ و سیّاح اور جہاں دیدہ جہاں گرد ہوں مجھ سے سُنئے چین میں افیون کی کثرت سے تیس برس اور پورے تیس برس کے بعد لڑکا پیدا ہوتا ہے"

"واہ رے جھوٹ۔ خدا کی مار اس کذب پر" کسی طرف سے آواز آئی۔ خوجی بہت ہی بگڑ کر بولے "کیا کہا یہ آواز کدھر سے آئی۔ ارے یہ کون بولا تھا۔ یہ کس نے کہا کہ جھوٹ ہے قتل کر ڈالو انکو اور ان کے سب شرکا کو ہم اور جھوٹ مگر ہم ہی چوکے۔ اس قدر غصّہ نہ چاہیئے۔ اچھا بابا ئے من بدیع ہم کاذب۔ ہم دروغ گو ہم جھوٹے بلکہ ہمارے باپ بے ایمان اور جعلساز اور زمانے بھر کے دغاباز خیر۔ مانا یہ کہ افیم پینے سے عمر کم ہو جاتی ہے پھر اس سے مطلب۔ افیون کی بدولت انسان کے قوائے مختلف کو اس درجہ طاقت حاصل ہوتی ہے کہ باید و شاید۔ اسی سبب سے مرد پیر جوان اور جوان بچہ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا کیا خیال کرتے ہیں بیدار افیون دوست

نسبت عمر و سن و سال من بدیعا کہے ۔

"حضور چہل و شش ہوں گے "

"کوئی پچاس کے پیٹے میں ہوں گے "

"حضور کوئی ستّر کے ہوں گے "

" ہمارا بدن چور ۔ قد چور ۔ لیاقت چور ۔ عمر چور ۔ سن و سال چور ۔ ہمارا سن نہ پچاس کا نہ ساٹھ کا دو اوپر سو برس کے ہیں جس کو یقین نہ آئے وہ کافر ملعون ۔ دو اوپر سو برس کا سن ہمارا ۔ دو اوپر سو برس کا سن ہوا ۔ اور ابتک وہی خم دم ہے ذرا آنکھ نہیں جھپکتی اور کہو ہزار سے مقابلہ کریں کہو لاکھ سے کہو کروڑ سے اور آگ میں کود پڑنا تو ہمارا خاص کام ہے جہاں لاکھوں کروڑوں توپیں دغ رہی تھیں اور ہزارہا آدمی برابر ادھر ادھر گر رہے تھے ۔ وہ پھر تو پکار اٹھی یہ ادھر وہ ادھر گرا + یہ مورچہ وہ ہاتھ وہ خود اور وہ سر گرا ۔ اور میں نے پیرانہ سالی میں انھیں ہاتھوں سے ہزاروں سر قلم کئے اور لاکھوں کو قتل کر ڈالا اور ہماری شمشیر محرابی لنگر دار سے بولی یہ تیغ دم سر اعدا پہ لوں گی میں + یرش پکاری تو بہ ٹھہرنے نہ دوں گی میں ۔ اس سن و سال کو دیکھئے اور اس حال کو دیکھئے واہ رے میں اور واہ ری میری جرأت ہمت آفریں!

اس کے بعد دوسرے افیم دوستوں نے کچھ فرمایا اور آخر میں خواجہ صاحب بولے " میاں عاجزی ہی خدا کو پسند ہے ۔ اس میں چاہے جو ہو بس یہ نکتہ یاد رکھنا بھولنا نہیں "

اس کے بعد سب نے چینی کی پیالیوں میں افیم گھولی اور خواجہ سر کی تندرستی کی پیالیاں پیں اور غیں ہو گئے "

خواجہ صاحب میاں آزاد کے دولت کدہ پر آئے تو دیکھا کہ کالج کے

طلبہ کا ڈیپوٹیشن میاں آزاد کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کر رہا ہے خوجی بھی بیٹھ گئے اور سننے لگے۔ جو طالب علم تقریر کر رہا تھا اُسنے خواجہ صاحب کے بابت یہ کہا، ہم آپ کے رفیق اور صافی مذاق مرد باخدا حضرت خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع دگلے والی پلٹن کے کیدان اور شاہی سکھے رسالدار بہادر کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں اگر ہم اس مقام پہ اُن کا ذکر خیر نہ کریں تو کفران نعمت ہے کیونکہ خواجہ صاحب نے باوصف کبر سنی و عدم واقفیت فنون جنگ میدان نبرد میں آپ کا ساتھ دیا۔

خواجہ صاحب یہ سنتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور بگڑ کر بولے آپ سب صاحبان طالب علمان کا قطع کلام ہوتا ہے مگر بندہ خاکسار اضعف العباد ارذل خلائق نابکار روسیاہ ہیچمرز خواجہ بدیع اس قابل نہیں ہے کہ آپ ان الفاظ سے یاد فرمائیں یہ تو تعریف نہیں ہجو ملیح ہے۔ فرماتے ہیں کہ باوصف کبر سنی وضعف و عدم واقفیت فنون جنگ بجا ہے کبر سنی کیا معنے۔ یہ کیونکر معلوم ہوا کہ یہ بندہ درگاہ پیر فرتوت ہے۔ ابھی مجھے یہ دعویٰ ہے کہ اچھے جوان بلند بالا اور قوی ہیکل کا ہاتھ پکڑ لوں تو چھڑائے نہ چھوٹے۔ کیا دل لگی ہے مصر کے پہلوان کو اُٹھا اُٹھا کے دے دے مارا اور جہاں گیا ایک بھی ہم پلہ نہ ملا۔ ضعف کی اچھی کہی۔ ہمارے ہی ایسے اگر دو چار ضعیف اور ہوں ہندوستانی دیو کہلانے لگیں مگر ہے کیا ہمارا بدن چور ہے۔ اور پھر آپ فرماتے ہیں کہ فنون جنگ سے عدم واقفیت ہے۔ ہونھ! کمیدان ہم رہے رسالداریاں ہم نے کیں مصر کے پہلوانوں سے ہم لڑے اختری اور نادری پلٹن اور بانکا رسالہ ان سب کے افسر ہم رہے کالے نکٹر کی لڑائی ہم لڑے اور ابھی تک ہم ناواقف ہی ہیں اصل تو ہم کا ملاں القاب کے پاس کچھ نہیں تھا۔

اس تقریر پر بڑا قہقہہ پڑا اور طلبہ نے بلجاجت خواجہ صاحب سے معافی مانگی اور خواجہ بدیع کا اعزاز کیا اور من بدیع کا رہی ستر گ کردہ شدہ بود آمدہ "

اس کے بعد آزاد تو ڈیپوٹیشن کا جواب دیتے رہے خواجہ صاحب آزاد کی برات کے سلسلہ میں انتظامات کرنے چلے آئے۔

اب برات کے جلوس میمنت مانوس کا حال سنئے کہ آدھی رات سے شہزادگان گردوں مدار اور نوابان جم اقتدار اور امراء والا اور دربان اور مہاجنان والا شان کے ہاں سے جلوس آنے لگا اور دو بجے تک اتنی کثرت ہوئی کہ دو رویہ بازار میں دور تلک تل رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ اتنے میں دگلے والی پلٹن کے کمیدان میاں خواجہ بدیع الزماں صاحب من بدیعا بدیع نے انتظام شروع کیا۔ حسب عادت کسی کو ڈانٹ کسی کو ڈپٹ کسی سے لڑ کسی سے جھگڑ یوں ہی راستے ہی بھر انتظام کرتے رہے اور بات بات پر کہتے جاتے تھے " واللہ نوشاہ اور ہم آج بدرجہ اتم خوش و خرم اور مسرور و اکرم ہیں " اور زر سرخ و سفید کی بوچھار کرتے جاتے تھے۔

شادی کے بعد آزاد نے عیش و عشرت اور نیکنامی کے ساتھ زندگی بسر کی اور فرط ہمدردی سے ہموطنوں کی ترقی میں ہمیشہ ساعی رہے۔ خوجی بھی مرتے دم تک ان سے متعلق رہے۔